

PARHLO PAKISTAN

اب آپ ہر قسم کے ناول ہماری ویب سائٹ
سے مفت حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہماری ویب سائٹ ناولز رہٹرز کے لئے آفر
بھی دیتی ہے۔ اگر آپ لکھنے کے شائق ہیں تو ہم سے رابطہ
کریں۔ آپ کے ناولز کے علاوہ ناول کے بہترین ہونے
پر آپ کو کیش پرائز بھی دیں گے

ابھی اپنا ناول EMAIL کریں اور اپنے لکھاری ہونے کا فائدہ اٹھائیں۔

WHATSAPP GROUP : 0318-9992829

PARHLO.COM.PK@GMAIL.COM

پلکوں سے اٹھائیں اس کو

رفعت سراج

محبت کا پرندہ بسیط فضاؤں میں رقص کرتا ہے۔
 انا قید خانہ ہے۔
 محبت سپردگی وہی ساختگی کا استعارہ ہے۔
 انا ماضی کا اپنی شکنجہ ہے۔
 محبت امن ہے... انا جنگ ہے۔
 محبت من کا سرور ہے... انا ”ذکہ بدن“ ہے۔
 محبت بہاؤ ہے... انا مزاحمت ہے۔
 محبت فراست ہے جس سے چراغ جلتے ہیں۔
 انا عیار زبانیت ہے جس سے ایٹم بم بنتے ہیں۔
 محبت کائنات کا ضمیر ہے... انا شیطان کا خمیر ہے۔
 محبت کے نصاب میں سوال ہیں۔
 محبت خیر مقدم ہے... انا ماتم ہے۔
 محبت جنازہ پڑھواتی ہے... انا جنازہ اٹھواتی ہے۔
 محبت علیین... انا ساقلین۔

وہ مرے پاس ہے کیا پاس بلاؤں اس کو
 قید کروں اسے آنکھوں کے نہاں خانے میں
 چاہتا ہوں کہ کسی سے نہ ملاؤں اس کو
 چلنا چاہے تو رکھے پاؤں مرے سینے پر
 وہ مجھے اتنا تنگ اتنا تنگ لگتا ہے
 کبھی گر جائے تو پلکوں سے اٹھاؤں اس کو

دور دیوں سے نڈھال اکیسویں صدی کے آدم و حوا کی کہانی

چند لمبے خالی الذہن مکر، مکر دیکھنے کے بعد مرثیہ یوں حواس میں آئیں گویا اب قیامت تک نہ سونے
 جرات نہیں کریں گی کہ ایک منٹ کے لئے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔
 ”کیا ہوا زمین..... ڈونٹ دری، میں ابھی اسٹاف کو کال کرتی ہوں۔“ مرثیہ برق رفتاری سے بیڈ سے اتر کر
 زمین کے سرہانے گئے گھنٹی کے بٹن کی طرف لپکیں مگر زمین نے انہیں پیچھے سے جالیا بلکہ اپنے بازوؤں میں دیوچ



”تم نے نوٹ کیا ماریہ، یہ لڑکا میری بیٹی کی جان کا دشمن ہے۔ اگر اس لڑکے نے یہ ڈراما نہ کیا ہوتا تو آرتھرشلہ کتنی خوش نظر آ رہی ہوتی، اپنے پارنٹر کے ساتھ کچھ کہہ سن لیتی تو آج کی صبح وہ کھلتے گلاب کی طرح تروتازہ نظر آتی اور اسے خوش دیکھ کر مجھے کتنی انرجی ملتی۔“ شمیمہ حیرت انگیز طور پر چھڑی کے سہارے چلتی ہوئی انکیسک چل آئی تھیں۔

انکیسک کا بڑا سا بڑا آمدہ جس کی چھت کو چار ستون سہارا دیے ہوئے تھے، کوئی دیوار نہیں تھی، کسی جامع مسجد کے کھلمن ہی کا تاثر دیتا تھا۔

شمیمہ اپنے ہی گھر کا ایک وسیع حصہ عرصہ دراز بعد دیکھ رہی تھیں ورنہ ماریہ ان سے صرف ایک کال ہی کی دوری پر رہا کرتی تھی۔

شمیمہ آہستہ آہستہ چھڑی کے سہارے آگے بڑھ رہی تھیں، سامنے بڑا سا آئینوی دروازہ تھا جس کے ذریعے ہی اندرونی حصے میں رسائی ہوتی تھی۔ اس بڑے دروازے سے گزر کر ایک وسیع راہداری آتی تھی جس کے ایک طرف تین بڑے بیڈروم بنے ہوئے تھے اور کمروں کے سامنے اوپن ایریا تھا جہاں پھول پودے قطار در قطار سجے نظر آتے تھے اور پھلواری کے پیچھے ایک دیوار چین تھی جو انکیسک اور کوئی کو فرق کرتی تھی۔

تھا جیسے اسٹاف کو کال کرنے سے سختی سے روک رہا ہو۔

عرشلہ بدحواس ہو کر پٹیس اور پوری قوت سے زین کی گرفت سے خود کو آزاد کرایا۔

”کیا مطلب..... اسٹاف کو نہیں بلاؤں؟“ انہوں نے تعجب کی انتہا پر زین کی طرف دیکھا۔

زین نے انکار میں گردن کو دائیں بائیں گھمایا۔

”مائی گاڈ..... مجھے بتاؤ میں کیا کروں پھر؟“ عرشلہ نے بے بسی سے زین کی طرف دیکھا۔

زین نے پوری قوت سے آواز نکالنے کی کوشش کی، یہاں تک کہ وہ سرسراہٹ کے انداز میں کچھ کہتا نظر آیا۔

عرشلہ نے سرت آ میر حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بڑے جذباتی انداز میں اپنا کان زین کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

”جھجک گاڈ..... ہاں..... ہاں..... بولو..... فرائی کرو..... مجھے یقین تھا کہ میں ایک دن پھر سے تمہاری آواز سنوں گی۔ زین..... میری جان..... بولو..... کچھ بھی بولو..... مگر فرائی کرو..... میں سن رہی ہوں۔“ وہ زین کے ہونٹوں سے کان لگائے پھر جوش انداز میں بولتی جا رہی تھیں۔

”مام..... آپ صرف میری ہیں.....“ زین کی پچی، پچی آواز سرگوشی سے ممانکت رکھتی تھی۔

عرشلہ نے اب خوشی کے بجائے ہول کر..... دہل کر زین کی طرف دیکھا۔

”لیس، آف کورس..... میں تمہاری مدد ہوں اور تمہاری ہوں۔ تم کیوں اتنا تنیس ہو رہے ہو؟“

”who is Aamir?“ (عامر کون ہے)۔ زین کے حلق سے پھر پھنسی، پھنسی سرگوشی برآمد ہوئی جیسے کسی گویے کا گچا، گچا حلق بیٹھا ہوا ہو۔ عرشلہ نے کم کر زین کی طرف دیکھا۔

”تمہیں یہ سب قبول نہیں تھا تو مجھے تاپ کر کے بتا دیجئے، اپنی جان لینے کی کوشش کی..... خود بھی suffer کیا، مجھے بھی کرایا..... مگر میں پھر بھی خوش ہوں کہ جذبات کی شدت سے تم survive کرنے لگے۔ مجھے اور کیا چاہیے، بس یہی ناں کہ میرا بیٹا صحت مند، پریکٹ healthy ہو۔“ عرشلہ نے ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کرچیوں کو سمیٹنے کا کام آئندہ پراٹھا رکھا اور جذباتی انداز میں زین کو گلے سے لگالیا۔

”تم مجھ سے دل کی ہر بات کر سکتے ہو..... پھر کیوں نہیں کی؟ گزر رہی رہی تھی ناں، باقی بھی گزر جائے گی۔ خدا خواستہ تم ندرے تو مجھے دنیا کی کوئی خوشی بہلا نہیں سکے گی۔“

زین نے خود کو عرشلہ کی گرفت سے آزاد کر کے ان سے قدرے فاصلہ کیا اور عرشلہ کی طرف شہادت کی انگلی سے اشارہ کیا پھر وہی انگلی اپنے سینے پر رکھ کر کئی مرتبہ ضربیں لگائیں اور وہ بولنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

”یعنی آپ صرف اور صرف میری ہو.....“

اب زین کی آنکھوں سے تو اتارے آنسو بھی گر رہے تھے۔

عرشلہ جیسی نازوں کی پٹی پر ہمیشہ الفاظ سے زیادہ آنسو پوری قوت سے اثر انداز ہوتے تھے کیونکہ ان کے بازو اک اعصاب کچھ بھی زیادہ دیر برداشت نہیں کرتے تھے، نہ خوشی کی شدت نہ دکھ کی انتہائی کیفیت..... وہ کبھی بھی وقت غیر یقینی صورت حال تخلیق کر سکتی تھیں، یعنی بے ہوش ہو کر اپنی جان چھڑا سکتی تھیں۔ وہ تو زین کی آنکھوں سے آنسوؤں کی آبشاریں گرنی دیکھ کر تڑپ اٹھیں۔

”یعنی اگر میں نے عامر سے شادی کر لی تو یہ تباہیوں میں اسی طرح روتا رہے گا۔ not at all..... یہ نہیں ہو سکا، می کو اپنی بیٹی کی فکر ہے تو مجھے اپنے بیٹے کی۔“

عرشلہ طلوع صبح سے چند قدم دور گھڑی ہو کر یوں خیال کر رہی تھیں گویا اب شمیمہ کے کسی فیصلے کی ان کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں۔

ڈرتے ہیں، وہ کیا مرتے نہیں ہیں؟“ ثمنینہ بذاتی انداز میں بولتی جا رہی تھی، منہ سے تھوک ابلنے لگا تھا اور مارے کا یہ حال تھا کہ کھڑے، کھڑے بے وزن ہو رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے کی فواد کی قوت کی نادیہ راستے سے مائع بن کر بہنے لگی تھی۔ اس کے جسم پر ہلکی، ہلکی کچلی طاری تھی، ہاتھ ریشے کے سریشے کی طرح لرزاں تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑے بس ثمنینہ کی طرف دیکھنے جا رہی تھی۔ پوچھنے سے پہلے کی صبح کا زب کی دودھیا روشنی پھر کی سرخی پہاڑوں کے سلسلے کے عقب میں جا چھپی تھی، مگر میں روشن ہو گئی دینے کی طرح کی ٹھنائی روشنیوں ذہن میں پھیلی تاریکی کے سامنے اپنا کزور وجود دکھو رہی تھیں۔ وہ بولنے کی کوشش کر رہی تھی مگر زبان میں کوئی کلمہ گڑھی تھی۔

”ماریہ، ماں بہت خود غرض ہوتی ہے، اولاد کی خوشیوں پر کچھ دمانہ نہیں کرتی۔ میں نے عرش کے ہر بیٹے کو گیت آؤٹ کہہ دیا تھا اس لیے کہ وہ میری بیٹی کی کم عمری اور ناجی کو exploit کر رہا تھا، بہت زیادہ ”شوہر“ بن رہا تھا۔“

”مم..... مم..... مم.....“ ماریہ بولنے کی کوشش میں ہٹلانے لگی۔

”ماریہ، یہ لڑکا میری بیٹی کا خون پی رہا ہے۔ کیا تم اسے کھانے میں زہر دے سکتی ہو؟“

ماریہ کو یوں لگا جیسے وہ تختہ دار پر کھڑی تھی، گلے میں پھندا تھا، جلا دینے کیور کھایا، پاؤں تلے سے تختہ ہٹ گئے اور اس کا جسم پھندے کے ساتھ جمولنے لگا۔

محل جیسے بڑے، بڑے کمروں میں کتنی خاموشی سے آسب پلنے لگتے ہیں۔ ایک دوسرے کی خواب گاہوں کے بیچ آسب پلنے ہیں، ایک دوسرے سے پلنے کے لیے پہلے ان سے گزرتا ہوتا ہے، ملاقات سے پہلے حال بدل جاتے ہیں، ہزاروں گز کے رقبے پر پھیلائے محل نما گھر جس میں معصوم خوابوں کے دھنپے تھے، نامراد یوں کے ماتم تھے، میرے جواہرات، پونڈز، ڈالرز، یورو، ڈینار، ورہم کے سانچ بچھو تھے۔ اس پریش گھر میں سب ہی کچھ تھا جہاں کی شہزادے، شہزادی کی میزبانی بھی کی جاسکتی تھی، اگر کہیں تھا تو روحانی سکون نہیں تھا، بے ساختگی سے ہنسا سرسری نہیں تھیں۔

دور کی مسجد میں فجر کی پہلی اذان شروع ہوئی تو ماریہ چونکی۔ کھڑے، کھڑے اتنا وقت گزر گیا۔ ثمنینہ کی سانس دھونکی کی طرح چل رہی تھی۔

”فجر کی اذان شروع ہو گئی..... مم..... صبح ہو گئی۔“ اس نے بدقت چند الفاظ ادا کیے۔

ثمنینہ کی بند آنکھوں کے پونٹوں میں تپش ہوئی۔

”نماز پڑھو گی؟“

”جی ہمم، میں اور امی روزانہ اس ٹائم اٹھ جاتے ہیں۔ پہلے میں امی کو وضو کراتی ہوں پھر خود نماز پڑھتی ہوں۔“

ماریہ اب سنبھل رہی تھی، اذان کی آواز کی مقناطیسیت نے اس کی روح کو نئے سرے سے توانائی دینا شروع کر دی تھی۔ اذان کے ساتھ دوسری مساجد سے بھی اذانیں شروع ہو گئیں۔ اب کئی مسجدوں کی ملی جلی اذانیں گونجنے لگیں۔ کہیں اللہ اکبر، کہیں جی علی الصلاۃ، کہیں جی علی الفلاح، کہیں الصلاۃ الخیر من النوم آپس میں گڈنڈ ہو رہے تھے مگر اس کا اثر یہ تھا کہ پچھلے پہر کی وحشتوں سے نجات مل گئی تھی۔

”میرے بچہ شمس نے تو بھی مجھے جائے نماز پر کھڑا نہیں کیا کیونکہ ان کا تو زیادہ وقت غیر مسلم بزنس پارٹنرز کے ساتھ گزرتا تھا۔ پادری، یہودی، عیسائی، سکھ، ہندو، کیونٹ، یہ ہمارا سرکل تھا مگر میں نے نماز شروع کی۔ جب عرش پاگل ہونے کے قریب تھی، میں ساری رات اس کے بیڈ کے ساتھ جائے نماز بچھا کر اللہ سے باتیں کرتی تھی پھر بتا نہیں کیا ہوا، میں نے اللہ سے باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ نے مجھے پسند نہیں کیا کیونکہ میں نے سنا ہے کچھ لوگ پیدا کی دوزخی ہوتے ہیں۔

ثمنینہ نے آخری الفاظ سرگوشی کے انداز میں ادا کیے تھے۔ ماریہ تو یہ سن کر کھڑے، کھڑے بچوں کی طرح ہلک، ہلک کر رونے لگی۔

ثمنینہ نے دروازے کے قریب پہنچ کر بیٹل کے چمک دار جمولتے ہوئے سنڈل سے دروازے پر دستک دی کیونکہ اس طرف ڈور بیٹل کا کوئی نظام نہ تھا۔

بیٹل دستک کے توڑ مل میں صرف کیمبر خاموشی تھی، دوسری دستک پھر اس انداز میں ہوئی گویا شیشے پر پتھر دے مارا ہو۔ چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد اندر سے ماریہ کی سہمی ہوئی آواز لہرائی ہوئی ساعت سے کمرائی۔

”کون؟“

”ماریہ، دروازہ کھولو، اس سے پہلے کہ میری ڈیڈ باڈی دیکھو۔“ ثمنینہ کی اپنی آواز یوں کپکپا رہی تھی گویا وہ برقانی طوفان کی زد میں ہوں۔

پلک جھپکنے کے وقفے میں دروازہ وا ہو گیا۔ سامنے ماریہ ششدر کھڑی ثمنینہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ چار خانے والے ٹائٹ ڈریس میں تھی جس میں سیاہ رنگ نمایاں تھا، ہال ٹکڑے ہوئے تھے، آنکھوں سے لگتا تھا کہ بہت گہری نیند سے جاگی ہے۔

”مم..... مم..... آپ؟ آپ؟ آ..... آپ مجھے فون کر دیتیں، اتنی دور واک کر کے آئی ہیں..... اگر کہیں مگر جاتیں تو کسی کو پتا بھی نہ چلے۔“ ماریہ نے بے اختیار کیفیت میں ثمنینہ کو شانوں سے قہقہہ لیا۔

”مجھے لینے، لینے محسوس ہوا کہ میں زندہ نہیں ہوں، قبر میں آنکھ کھلی ہے۔ میں اتنی خوفزدہ ہوئی کہ خود کو یقین دلانے کے لیے کہ میں زندہ ہوں، واک شروع کر دی۔ پلنے، پلنے آنکھیں تک آ گئی۔“ بولتے، بولتے ثمنینہ کی سانس اکھڑنے لگی۔

ماریہ نے گہرا کر کسی چھوٹے بچے کی طرح ثمنینہ کو اپنے بازوؤں میں سیٹ لیا۔

”اوہ مائی گاڈ، آئے میں آپ کو بیڈ تک لے کر جاتی ہوں۔“ ماریہ نے تھوڑا سا دباؤ ڈال کر ثمنینہ کو آگے قدم رکھنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔

”میں آگے کیسے پاؤں رکھوں، مجھے تو محسوس ہو رہا ہے میری ٹانگیں بے جان ہو چکی ہیں..... دیکھو، مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی۔“

یہ سن کر تو ماریہ کے اوسان جاتے رہے، ساڑھے پانچ فٹ کی نازک اندام لڑکی کے سامنے پورے قد کی 70-75 کلو گرام وزن رکھنے والی بوڑھی عورت تھی جو اس وقت اپنے وزن پر کھڑی بھی نہیں ہو پا رہی تھی لیکن زندگی بچانے کے لیے کسی بھی انسان کے اندر جو جذبہ اپنی پوری قوت سے ابھرتا ہے اس کی شدت سے لوہا بھی موڑا جاسکتا ہے، شرط یہ ہے کہ خیال کی شدت میں کوئی بھی ملاوٹ نہ آنے پائے۔ اسی تکنیک سے جوڈو کرائے میں بلاکس توڑے جاتے ہیں۔

ماریہ کا ذہن صرف ایک نکتے پر مرکوز ہو گیا کہ ثمنینہ کو بیڈ تک لے جانا ہے۔ اس نے ثمنینہ کو اپنے زور پر کھینچنا شروع کیا، اسے خود چٹا نہیں تھا کہ اس کے اندر کیسے کسی جن کی توانائی حلول کر گئی تھی۔ وہ ثمنینہ کو اپنے زور پر کھینچ رہی تھی۔ ثمنینہ کو یہ سب کچھ کسی تشدد سے کم نہیں لگ رہا تھا مگر ماریہ کی شدت کے سامنے وہ زبان کو حرکت نہیں دے پا رہی تھیں۔

ماریہ ایک پہاڑ کاٹ کر لاؤنچ تک پہنچ گئی تو ثمنینہ نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر کر کے اسے رک جانے کا اشارہ کیا اور صوفے کی تختی پر ہاتھ رکھ کر صوفے پر خود گرا لیا۔

”ماریہ، میرے بعد تم نے عرش کو سنبھالنا ہے، اس لڑکے کا بیک گراؤ بہت کمزور ہے، اس کا باپ بیٹی کی پیدائش سے نفرت کرتا تھا، اس نے اپنی پہلی بیٹی بھی کسی بے اولاد کو دے دی تھی، دوسری بیٹی اس کی ماں نے اسپتال میں ہی چھوڑ دی تھی۔ ذہن کی دفعہ میں نہ بیٹی نہ بیٹا، ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ پندرہ سال کی عمر میں شاید اس کا آپریشن ہوگا اور اس کی gender (جنس) کنفرم ہوگی مگر رجحان male کی طرف ہی ہے۔ ماریہ، ہم اندھیرے میں لٹ گئے، میری محسوس بیٹی ایک جال میں قید ہو چکی ہے، زمین اس کی خوشیوں کا دمن ہے۔ مجھے مرنے سے ڈر نہیں لگتا، جو

”نو.....میں.....نو..... اللہ کا دوسرا نام محبت ہے۔ اللہ کے پیار کے سہارے تو ہمارا وقت گزر رہا ہے، اسے بڑا نہیں دینے کی کوئی جلدی نہیں ہوتی۔ میں اتنی مشکل زندگی گزار رہی تھی کہ مجھے کبھی اللہ سے دعا کرتی رہتی تھی۔ دیکھیں پھر اللہ نے عرض کیا کہ میں سے ملا دیا، ہر طرح کی آسانی دے دی، میں تو رات سونے سے پہلے شکرانے کے دو نفل لازمی پڑھتی ہوں۔ اللہ کو gratitude (شکرگزاری) بہت پسند ہے نا۔“

اب ماریہ فریٹ پر دو زانو بیٹھ گئی اور شینہ کا ہاتھ تمام لیا اور پیار سے دبانے لگی۔

”اس کا مطلب ہے کہ ہم کچھ تو اچھے ہیں نا، ہماری وجہ سے ماریہ کمرٹ اسپل لیل کرتی ہے۔“ شینہ کے انداز میں اس بچے کی سی بے ساختگی تھی جس کو مایوسی کی انتہا پر اچانک من پسند کھلونا مل گیا ہو۔

”آپ لوگ تو بہت گریٹ ہیں میں، آپ دوبارہ سے اللہ سے باتیں کرنا شروع کر دیں پھر کبھی بھی آپ تنہائی میں نہیں ڈریں گی۔“

”اچھا..... پھر تو شاید میرا بڑا بیٹا بھی ڈسٹرب نہیں کرے گا، اکثر وہ اگر مجھ سے باتیں کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اب جو چلا گیا، وہ چلا گیا، اب اسے نہ برنس سرکل میں سوو کرنے کی ضرورت ہے نہ لوگوں کو ڈنر پر انوائٹ کرنے کی۔ اس نے پورا سیٹ اپ لگایا ہوا تھا باربی کیو کا، کسی وقت بھی فون کر کے کہتا تھا اس بارہ لوگوں کے لیے باربی کیو لگوادینا، اب مجھے اپنے بھی بہت کام ہوتے تھے، سب کچھ بھول کر کام میں لگ جاتی تھی۔ بہت تھکا مارتا تھا، اب ٹھیک سے سونے نہیں دیتا، اب میں اللہ سے کہوں گی پلیز، اسے آپ ریٹ دیں تاکہ میں بھی کچھ ریٹ کروں۔“ بولتے، بولتے شینہ کے شدید غلغلے نے آلیا تھا۔ شینہ کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

اب یہ نیا کام ماریہ کے سر آن پڑا تھا۔ بندہ ہوش میں ہو تو کھینچا، ٹھینچا پھر بھی آسان ہوتا ہے، جب انسان خود ارادی کی کیفیت سے باہر ہو تو اس کا وزن لینا ایک نازک اندام لڑکی کے بس کی بات تو ہرگز نہیں ہو سکتی۔

ماریہ کو فجر کی نماز بھی ادا کرنا تھی، اس سے پہلے وضو بھی کرنا تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے بھی کی کیفیت میں شینہ کی طرف دیکھتی رہی پھر تھوڑی مشقت اٹھا کر انہیں صوفے پر سیدھا لانے میں بہر حال کامیاب ہو گئی تھی۔

☆☆☆

”پاپا، رات انصر کہہ رہے تھے کہ ان کے پاس صرف دو دن ہیں۔ آج وہ مجھے ڈنر پر لے جانے کا بول رہے ہیں، میں نے کہہ دیا تھا کہ ماما، پاپا سے پوچھ کر کتنی کر دوں گی۔ پولیس، میں ان کو کیا کہوں؟“

فری ناشتے کی میز پر سالار صاحب سے مخاطب تھی۔ سارہ بچن میں سالار صاحب کے لیے ان کی خاص کافی تیار کرتے ہوئے سب کچھ کن رہی تھی، فری کی بات پر وہ خامی بے چینی محسوس کرنے لگیں، وہیں سے کچھ کہنے کا ارادہ کیا مگر پولیس کھڑے شیف کی طرف دیکھ کر خود کو روک لیا اور تندی سے کریم کافی مکس میں ڈال کر کافی تیار کرنے میں جٹ گئیں۔ سالار صاحب بھی، بھی ناشتے میں کافی لیتے تھے، خاص طور پر جب رات کو دیر سے سوتے تھے اور نیند پوری نہیں ہوتی تھی۔

”آج وہ آفس تو نہیں جا رہے تھے مگر کسی ہوٹل میں ایک خاص میٹنگ بھلنا تھی اس لیے آج صبح آٹھ بجے کے بجائے دن کے گیارہ بجے ناشتا ہو رہا تھا۔ فری کو یوں تو کالج سے چھٹی کرنے کے بعد دیر تک سونے کی عادت تھی مگر آج وہ کسی کے جگانے سے جو شتر خود ہی اٹھ کر اور تیار ہو کر ناشتے کی میز پر آ گئی تھی۔ شہر میں انصر کی موجودگی کا اثر تھا یا غالباً دیرینہ خوابوں کی تکمیل کی سرخوشی نے بستر چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ انصر کی خوب صورت باتیں جو نکاح کے بندھن میں بندھنے کے بعد کوئی بھی نیا نو لیا دو لھا اپنی دلہن سے کر سکتا ہے اس کے کانوں میں جنوز امرت چکار رہی تھیں۔ نو جوان دو شیرہ جو کی شہزادے کے سپنے کے ساتھ سونے جا گئے تھے، جب عملاً ایسی باتیں سننا شروع کر دے جو ذات کو محروم کر دیتی ہوں تو احساسات اتنے نرم اور دھماکے سے ہوجاتے ہیں کہ اسی بحر میں کھو کر زندگی کو

صاحب نے بھی جگہ مزا جی کا مظاہرہ کیا جس پر سارہ نے گہری طمانیت محسوس کی۔
فری کی اب بلا سے کمر ماں، باپ کیا، کیا باتیں کریں گے، وہ تو پتہ لگا کر فضاؤں میں اُڑ رہی تھی، ایک شاعر
خوابناک ماحول والا عشائیہ اس کا شکر تھا۔

☆☆☆

”مجھے پہلے ہی پتا تھا، یہ لڑکا سارا ڈراما ہی اس لیے کر رہا تھا۔ میں ابھی ٹوٹو کو کال کر کے بتا دیتی ہوں۔“ ثمنینہ غیظ و غضب کی کیفیت میں جھاگ اڑا رہی تھیں۔

”ہی، جیسے آپ ”یہ لڑکا“ ”وہ لڑکا“ کہتی ہیں وہ ہمارے گھر میں زبردستی نہیں آیا، ہم اسے بہت پیار سے لے کر آئے تھے۔ میری لائف میں اس کی ”yes“ اور ”No“ کی بہت اہمیت تھی۔“ مرشل شاید زندگی میں پہلی بار ”حالت مسکینی“ سے باہر آکر بہت اعتماد سے بات کر رہی تھیں جبکہ ان کے حوصلے و اعتماد کی بنیاد اعلیٰ درجے کا احساس کسرتی ہی تھا۔ یعنی عامر جب شریک سفر کے روبرو میں ہمراہ ہوگا تو وہ کیا، کیا کچھ اس سے چھپائیں گی، کیا کچھ کھولنا چاہیں گی، کہیں کچھ چھپانے، پوشیدہ رکھنے کی کوشش ہی میں کوئی ناکرہ جرم ثابت ہو جائے۔ پھر زین کی طرف سے آنے والے مختلف مسائل وہ کب تک عامر سے شیئر کرتی رہیں۔

زین کی وجہ سے ”پہلا“ چھوڑ گیا، زین ہی کی وجہ سے ”دوسرا“ بھی نہ چھوڑ جائے۔
خوف، اندیشے، گمان، خیالی پلاؤ..... یہ ساری کیفیات انسانی جبلت ہیں، عین فطرت ہے، یہ اور بات کہ
سب جانتے ہیں کہ یہ ختی رویے، ختی جذبات و کیفیات ہیں مگر انسانی فطرت پھر بھی کھیلنے سے باز نہیں آتی اور یہی
متضاد کیفیات انسان کو نجومیوں، ستارہ شناسوں، مستقبل کے احوال و استعارے بتانے والوں کے پاس لے جاتی ہے،
تاکہ مستقبل کی کوئی ”سند“ دستیاب ہو، اندازوں سے کھیلنے کا نذاب ختم ہو۔

مستقبل کا حال جاننے کی تڑپ اتنا بے چین و مضطرب کر دیتی ہے کہ انسان اس دوران زندگی کی سب سے بڑی حقیقت یعنی ”موت“ کو فراموش کر دیتا ہے۔

مستقبل میں میں چاہی مرادیں پوری ہو رہی ہیں یا نہیں مگر ایک امر تو تصدیق شدہ ہے کہ ”موت“ ہر ذی روح کا آنے والا ہے یا مستقبل ہے اور وجدان کہتا ہے موت بھی زندگی کا مستقبل نہیں ہے۔ اس مرحلے سے آگے بھی زندگی مسلسل سفر میں ہے۔

”پڑاؤ“ کو منزل سمجھ لیتا، مجھے والے کی کوتاہ علمی یا خود فریبی ہے، یہ کسی دوسرے کی ذمہ داری کبھی بھی نہیں ہو سکتی، گویا اندیشے ماضی کے خوفناک تجربہ کے ہاتھوں رہن تھے۔

ماضی ایک یاد اور تجربے کے علاوہ اور کچھ نہیں مگر انسان اکثر یہی غلطی دہراتے چلے آ رہے ہیں کہ ایک ”جر“ کو زندگی کا ”کل“ بنا کر رکھ دیتے ہیں اور گھمکرتے، کرتے اپنا وقت پورا کر جاتے ہیں۔

عمر شہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ٹھہرا تھا۔ عامر کی محبت بھری سرگوشی "ماشق" کی کسی خوفناک "دھماکا" میں حلوں کر جاتی تھی۔

عشرملہ نے ماں سے لمبی چوڑی بحث نہیں کی، بس ماں کو اپنا حسی فیصلہ سنا کر جگہ چھوڑ دی تھی، باہمی دیکر (دوسرے لفظوں میں) شمنہ کو مال فروشے کے لئے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ ان کے گمان و اندیشے اتنے مضبوط

تھے کہ امیدیں منہ چپا کر بھانٹے پر مجبور تھیں۔ اس پر کمال یہ تھا گمان پر ہی ”عین العین“ کی خود ساختہ مہر تھی۔

مرسدس کے بیکاروم کا دروازہ بند کر کے ہوئے عینہنی بٹندا وائری جو مار یہ لو اس طرح اوازیں دے رہی ہیں
کو مالے ساتوس آسان سے زمین برآنا تھا۔

☆☆☆

ماں جی اور میں

آج کل جیسے لے چلے سے دناتے کچھ ٹھنڈے کچھ گرم۔ ہماری اسکول سے تشریف آوری ہوئی۔ چاہے سے لی اپنی چھائی میں رہی۔ ای جان سے پوچھا۔ "کادے بال کے کھاداں۔۔۔۔۔" مکھن، وہی، ساکن سب کچھ تھا۔ ماں کچھ صرف تھیں دوسری بار پوچھنے پر چلے بولیں۔ "میرے بال کے کھالا۔" اور ہم نے روئی کے ٹوٹے ماں کے بازو سے رگڑ کے کھانے شروع کر دیے۔ ماں نے ڈاکر بھی۔ پھر بولیں۔ "اور یہ فرسٹ اونڈی آ آجی دی لاڈلی عقل رتی برابر نہیں۔" اور ہمیں کولی میں مکھن کے اوپر شکر ڈال کے دی۔ ماں تھیں۔۔۔۔۔ کہ اللہ کے بعد ماں، باپ ہی تو ہوتے ہیں جو اپنے دل کو تھما نہیں چھوڑتے خواہ قبر میں ہی آرام فرما ہو چکے ہیں۔ دوبارہ سچ ہی ہوتے ہیں کسی یاد کی صورت کبھی دعا صورت، کبھی صحت کے لیے بھی، کبھی مسکراہٹ کے دے میں۔ یا اللہ میرے والدین کو جنت الفردوس میں اپنے دُوبِطلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جوار میں جگہ عطا فرما آمین!

از: حدیث اختر، حاصل پور

از: حدیث اختر، حاصل پور

ان کی آنکھوں کے تیز کو بدلے دیکھا
ہم نے دنیا میں کیا کیا نہ بدلے دیکھا
روح بچ کر کسی کی اپنے لفظوں سے
خود فظ آف سے ہر لفظ بچے دیکھا
کسی کی راہ روک کر دانستہ کوئی کر کے
ہم نے لوگوں کو قسمت سے اچھے دیکھا
پتھروں کو سنوارتے تھیں سے بچاتے دیکھا
ہم نے کالج سے ہیروں کو رولے دیکھا
وہ جب چاہیں مجھے دیکھ کر ان دیکھا کر دیں
اور اپنی دقت ان کی بات بھی پکارتے دیکھا
کسی کے ہاتھ سے چین کے روٹی بتا رہے ہیں مگر
ہم نے لوگوں کے احساس کو مرنے دیکھا
دھوپ میں اوروں کو جلانے والوں کو
ہم نے ہر گھڑی بارش کی تمنا کرتے دیکھا
پنے بچ ہونے کا کوئی وقت ملے ہے زندگی میں
ہم نے بن بادل بھی ہر سات کو برستے دیکھا

مز: درود بخاری، کراچی

۱۲: ورود بخاری، کراچی

شمسہ فرخ کھولے قدرے پریشانی کی کیفیت میں جائزہ لے رہی تھیں۔ سارہ نے صاف سقمے ڈیوں میں کھانا پیک کر دیا تھا جو ابھی تک جوں کا توں رکھا ہوا تھا۔ رات گھر واپس آئیں تو وادعہ سوتا ہوا ملا تھا، صبح وہ چائے اور ایک کپ کیک کا ناشتا کر کے یوں گھر سے نکلا تھا جیسے کسی تعاقب کرنے والے سے جان بچا کر بھاگ رہا ہو۔ شمسہ نے بھی اس کے اندازہ کیچہ اپنی طرف سے کوئی بات شروع نہیں کی تھی۔ کچھ دیر پہلے واپس آیا تو یہ کہہ کر شاور لینے چلا گیا کہ اس نے کینے ٹیریا میں بڑا ہیوی جسم کا گر کھالیا تھا اس لیے اسے بھوک نہیں ہے۔

شمر نے ایک ڈبے سے تھوڑا سا نمک کڑا ہی نکال کر گرم کر کے اپنا کام تو کر لیا تھا، اب یہ سوچ رہی تھیں کہ اتنا اچھا کھانا فریز کر دیں یا ماسی کو دے دیں جو سہ پہر تین بجے کے قریب آکر گھر صاف کرتی تھی۔ شمر کے ہاں شروع سے ماسی کا یہی وقت مقرر تھا کیونکہ وہ خود دو بجے تک گھر آتی تھیں، کھانا کھا کر ظہر پڑھتی تھیں، اس کے بعد ماسی آجاتی تو اس سے گھر صاف کرواتی تھیں۔ گھر میں دو جانیں ہوتی تھیں، گھر تو چوبیس گھنٹے ہی صاف رہتا تھا مگر گرد مٹی صاف کرنے کا کام تو ابی جگہ رہتا تھا۔

”یہ بیف بریانی بہت مزے کی بنی ہوئی ہے، تمہارے رات کے کھانے کے لیے گرم کر دوں گی یا کچھ اور کھانا چاہتے ہو تو بتا کر مانا، اتنا کھانا رکھا ہوا ہے، اسے لے لو میں کچھ نہیں بناؤں گی۔“ شمس نے اذہ کے کلمے دروازے سے

”مج میں نے فریق میں بہت سارے ڈبے دکھے تھے ماں، آپ فریزر کورس اور فریڈا کا رخصتہ کا کھانا آنے سے

نیک کھاتی رہیں۔“ واصف نے شرٹ نیچے کی طرف کھینچتے ہوئے اودھ کھلے دروازے سے جھانک کر ماں کو سر دلچے

شمرہ کو لہجے سے ہی فیصلہ کرنا آسان ہو گیا کہ اس وقت جواب نہ دینا ہی مکمل جواب ہے۔ وہ بیٹا کچھ بولے

”ٹھیک ہے تو پر اہم..... فی الحال میں عامر کو کچھ کہہ کر روکتی ہوں اسے بالکل متنبہ نہیں کرتی اس لیے کہ عامر جیسا بندہ شاید تمہاری زندگی میں دوبارہ نہ آئے۔“ ٹوٹو نے گہری سانس لے کر اپنے تئیں الفاظ سے نکالے۔
”کیوں اس پھسل میں کا نام ضائع کر رہی ہو؟ اور یہ بات کہ عامر جیسا بندہ شاید دوبارہ نہ ملے تو ایسا ہی خیال اس وقت بھی تھا جب میری پہلی شادی ہوئی تھی۔“ عرشہ نے اٹھی کی پوروں سے اٹھ جھٹکتے ہوئے بھڑائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

”ہوں..... اوں..... اوں۔“ ٹوٹو نے ایک طویل ”ہوں“ کی آواز منہ سے نکالی۔
”جب تک یہ خوف تمہاری جان نہیں چھوڑے گا تب تک تمہاری لائف میں کچھ پوزیشنیں آسکتی۔“ ٹوٹو اب دل شکستہ نظر آئی۔ ”مک سے کہہ رہی ہوں برائے ٹرسٹ کی بیسٹ سٹر جک پر change your thinking change your life کتاب واقعی ایک راستہ ہے کسی کے خیالات تک پہنچنے کا۔ روڈ درخت اور شیلے کی پٹری (شاعری) پڑھ، پڑھ کر چاند پر چڑھی۔ ٹی ٹی ہو، زمین پر اترنے کا نام ہی نہیں لے رہی ہیں۔“
ٹوٹو یوں نہیں تھی، وہ بھی تھی کہ ایک جیتی جاگتی زندہ حسین عورت اپنے خیالات کی گرفت سے خودی باہر آنا نہیں چاہتی۔ اس کے خوف، اس کے عقائد میں یکے ہیں۔ وہ دوستی بنانے والی انسان دوست عورت تھی، ہار نہیں مانتی تھی، دوست کے اتفاق نہ کرنے پر اسے چھوڑنے کا خیال اسے بھی چھوٹا بھی نہیں تھا۔ شاید انسانیت کی..... بے لوث، بے غرض خدمت کرنے کا یہ انعام تھا کہ وہ ہمیشہ توانائی سے بھرپور رہتی تھی۔ اس کی صحت قابل رشک تھی کیونکہ وہ دعاؤں کی توانائی کھاتی جیتی تھی، اس کی آنکھیں روحانی مسرت سے دھکی رہی تھیں لہذا اس نے ”فی الحال“ کے ضمن میں عرشہ کو تنہا چھوڑنے کا دواش مندانا فیصلہ کیا اور اگلی منزل عامر کا ٹھکانا ٹھہری۔

☆☆☆

”آج میں نے دونوں بچوں کو فری کر دیا ہے کیونکہ مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔“
مدھقا گولڈن پلاواری سے آراستہ سیاہ لائٹ ڈریس میں داصف کے سامنے بیٹھی تھی۔ بال سٹ کر کچر میں متید تھے، ٹھیک اپ اتنا بھر پور تھا جو عمو مان بارانی خواتین کے چہرے پر نظر آتا ہے جن کو بارات کا فقید الشال استقبال ہونے کا کامل یقین ہوتا ہے۔ داصف کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اسے اناڑی جاننے کے باوجود موت کے کتوں میں موڑ سنا سکر چلائے پر مجبور کر دیا ہو، حلق یوں بند تھا گویا کسی گلیے شمر نے لڑھک کر چٹان کا منہ بند کر دیا ہو جو شاید صدیوں سے اسی گلیے شمر کے انتظار میں منہ پھاڑے ہوئے تھی۔
”ارے، میں بتی بولے جا رہی ہوں، تم بولتے کیوں نہیں؟“ مدھقا نے داصف کے ہونٹوں پر کوئی تادیبہ ”زپ“ دیکھ لی تھی۔

”جی..... سیم..... میں سن رہا ہوں۔“ داصف نے بدقت تمام حلق سے آواز نکالی۔
”میں جانتی ہوں تم اچھے سانح ہو مگر کچھ تو یلو۔“ مدھقا کا انداز جارحانہ تھا۔
”جی..... میں پہلے آپ کو سنوں گا پھر کچھ یوں گا کیونکہ آپ نے باتیں کرنے کے لیے بچوں کو فارغ کیا ہے۔“ داصف کے انداز نے کسی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ بچوں کو پڑھاتے ہوئے دو گھنٹے گزرنے کا پتا نہیں چلتا تھا اور اس وقت یہ عالم تھا کہ کائنات نے سانس روک کر گھڑیال جام کر دیے تھے۔
”ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ داؤد کا گھر میں نے خراب نہیں کیا، اس نے خود اپنی بیوی کو غصے میں طلاق دی تھی۔“
”جی، طلاق غصے ہی میں دی جاتی ہے، محبت کی وجہ سے تو بندہ شادی کرتا ہے۔“ داصف کے منہ سے بلا ارادہ وہ سبے سا خستہ نکل گیا جبکہ لب کشائی پر پہنچتا دے کا ٹھل بھی ساتھ ساتھ شروع ہو چکا تھا۔
”یہ بات..... ارے، تم تو واقعی جھٹکتی ہو۔“ مدھقا کی آنکھیں فرط مسرت سے چمکتی لگیں۔

فرح کا دروازہ بند کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئیں۔
”میں تو خود یہ سب ساتھ لانا نہیں چاہتی تھی مگر بھائی کو منع کرنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔“ وہ آہستگی سے دروازہ بند کرتے ہوئے خودی سوچ رہی تھیں۔ مگر داصف کو کسی قسم کی لفظی صفائی دینے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔

☆☆☆

”یعنی تم نے ایک جنسل میں کوتاہی کر رکھ دیا اور پردا بھی نہیں کی۔“ ٹوٹو نے عرشہ کے کمرے میں کھتے ہی راش پانی لے کر عرشہ پر چڑھائی کر دی تھی۔
”پلیز ٹوٹو، اسوشل ہونے کی ضرورت نہیں، عامر بالکل پرفیکٹ ہیں۔ وہ جس سے بھی شادی کریں گے وہ کبھی ہوگی، انہیں لائف پازر بہت آسانی سے مل جائے گا لیکن زین کو کچھ ہوا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کر سوں گی۔“
بولتے بولتے عرشہ کی آنکھیں نم ہونے لگیں، آواز بھرا گئی۔
ٹوٹو پر عرشہ کی بے بسی کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ خود بخود نرم پڑ گئی اور آگے بڑھ کر عرشہ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دیا۔

”ڈارلنگ، زین یک ہے، اسے بس کونسلنگ کی ضرورت ہے۔ شاید وہ تمہارے دور ہونے کے خیال سے خوفزدہ ہو گیا ہے، اسے کونسل کریں گے تو وہ ہو جائے گا، مجھے پتا ہے تم بہت جلد خوف میں مبتلا ہو جاتی ہو۔ لائف میں ہر چیز بغیر struggle (کوشش) کے نہیں ملتی، بہت سخت کرنا پڑتی ہے۔“ ٹوٹو اب بہت محبت سے سمجھا رہی تھی۔

”تو..... تو وہ بہت اسوشل ہے۔ ایک غلط کام کر کے اسپتال پہنچ گیا، اب میں کوئی رسک نہیں لوں گی۔ ابھی تک بھی تو گزری رہی تھی ناں۔“ عرشہ پر ٹوٹو کے دلائل بالکل بے اثر نظر آئے، بغیر وقفے کے ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔ ٹوٹو کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی اور عرشہ کا ہاتھ ان کی اپنی گود میں یوں جا کر جیسے ساحل کی ریت ہاتھوں سے پھسلتی ہے۔

”ہاں تو ٹھیک ہے، اس کو لے کر بیٹھتے ہیں، دو چار سال بعد وہ خود شادی کر کے اپنی دنیا میں کم ہو جائے گا اور تم اکیلی بیٹھی اس کو فرمت ملنے کا wait کیا کرو گی۔“ ٹوٹو بھلا ہار ماننے والی تھی؟ اسے تو نشانے پر نگاہ جما کر سر پٹ دوڑنے کی عادت تھی۔

”کوئی شیوری نہیں ہے۔ دو سال پہلے اس کا بہت پرفیکٹ چیک اپ ہوا تھا مگر اس نے آپریشن کا سنتے ہی مجھے کہا کہ مام، میں کوئی رسک نہیں لوں گا، ابھی میں ٹھیک ہوں، خوش ہوں، اگر آپریشن کے بعد مجھے disappointment ہوئی تو میں خود کو شوٹ کر لوں گا۔ ٹوٹو، میں نے یہ بات تم سے بھی شیئر نہیں کی اور می سے بھی چھپائی۔ می تو شاید پھر اسے اس گھر میں رہنے ہی نہ دیتیں۔ let see ٹوٹو، زین انوسٹ ہے، وہ زبردستی کر کے ہمارے گھر میں نہیں آیا، مجھے اپنی گود میں ایک ہنستا کیلٹا infant (شیرخوار) چاہیے تھا، ہم جلدی میں تھے کیونکہ ہم بیش اور آرام کے عادی لوگ ہیں، محنت سے بھاگتے ہیں، روٹین کا آرام نہ ملے تو نوکروں پر غصہ اتارتے ہیں۔ ہم زین کو لے کر آئے تھے، ہم نے اسے کہا کہ تم ہماری اولاد ہو۔ اس سارے قصے میں اس کا تصور کیا ہے؟ اب ہم اسے کتنی نارچہ کر کے کیا اس کی جان لے لیں؟ وہ تو پہلے ہی نامکمل ہونے کی وجہ سے دھکی ہے۔“
عرشہ جذباتی انداز میں بس ایک ہی سانس میں بولتی چلی گئیں۔ وہ تو شاید ابھی مزید بولیں مگر اب ان کی بس ہو گئی، اب چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر وہ بچوں کی طرح ہلکے ہلکے کر رہی تھیں۔

ایک مشہور اور قابل بھروسہ این جی او کی ہیڈ ہونے کے ناتے ٹوٹو دھکی انسانیت کے آنسو پونچھے، پونچھے عمر کے اس صے میں آگئی تھی جہاں سے ہر فیصلے سے پہلے رکے، وقت لینے کی پریکٹس شروع ہو جاتی ہے۔

کتنی آسانی سے جسٹس ہونے کا ٹیٹل مل رہا تھا۔ واصف کو لگا کہ اس دنیا کے اگلے پچھلے سارے جسٹس سر پکڑ کر رہے ہوں۔

”بالکل ٹھیک، اب اگر داد کو قصداً سمجھا تو اپنی بیوی کی کسی جہالت کی وجہ سے آیا ہوگا مگر میرے دشمن کہتے ہیں کہ تم اپنی دولت مند بھالی سے حسد کرتی تھیں، تم نے داد کا دل خراب کیا ہوا تھا، طلاق یا تہ نہر ہمیشہ بھائی کا گھر خراب کرتی ہے۔“

”آپ کے دشمن کہاں رہتے ہیں؟ اس گھر میں تو آپ صرف چار فیملی ممبر زہی ہیں، جہاں تک مجھے معلوم ہے۔“ واصف کو عجیب گراہ لگا پڑ رہی تھی کہ کہیں اس کی خاموشی اس شرم پائل عورت کے چہنچہ چلانے کا بہانہ نہ بن جائے اور گھر کے نوکر بند بات میں آکر خود اس کی ٹھکانی نہ کر دیں۔

”ارے دشمن تو پہلے گھر میں ہی رہتے تھے، دفغان ہو گئے سب۔“ مدلتا نے یوں شکل بنائی جیسے شرم کے پتے چار ہی ہو۔

”صدف بتا رہی تھی داد کی بیوی کالا جادو کرنے سا آٹھ افرتھا گئی تھی۔ وہاں کوئی بڑا مشہور Monk (بدھ راہب) ہے، اپنے دماغ کی لہروں سے کالا جادو کرتا ہے۔“ مدلتا پریقین لہجے میں بڑے جوش و خروش سے بول رہی تھی۔

”سوری ٹو سے..... سیم، Monk تو بہت religious ہوتے ہیں، عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر انسانیت کی خدمت کرنا پسند کرتے ہیں، چوٹی کو مارنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔“ واصف اس صریح غلط بیانی پر بلبل اٹھا۔ ”جادوگر ہونے کے لیے کہیں سے بھی بندہ دستیاب ہو سکتا ہے، بچارے سے بدھ راہب نے کسی کا کیا لگاڑنا ہوتا ہے۔“

”ہاں تو اس نے گیت اپ کیا ہوا ہوگا، صدف جھوٹ نہیں بول سکتی۔“ مدلتا اختلاف پر بھڑک اٹھی جس پر واصف نے بنیادی سوال بڑی ہمت کر کے کرنی ڈالا۔

”وہ..... سیم..... یہ صدف کون ہیں؟“

”ہیں.....؟“ مدلتا کو حیرت کا زور دار جھٹکا لگا جیسے واصف نے یہ کہا ہو کہ سیم ”چاند“ کیا ہوتا ہے؟ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔

”تم صدف کو نہیں جانتے؟ اس شہر کی نمبرون ”کٹنی“..... کوئی انجینی والے اس کو ہائر کر لیں تو اس سے بڑا جاسوس دنیا کو نہیں مل سکتا۔“

واصف بھی کوئی سڑک پر نہیں ملا تھا، ماں نے ہر طرح کا سکھ آرام مہیا کیا تھا۔ اب اس کی بس ہو گئی تھی، اس نے میز پر پڑا ہوا اپنا سیل فون اٹھایا اور کھڑے ہو کر جنرل کی چھٹی پاٹ میں ٹھونسا۔

مدلتا اب حیران، پریشان واصف کی طرف دیکھ رہی تھی۔ واصف نے تکلفاً بھی خدا حافظ نہیں کہا اور سیدھا باہر کا رستہ لیا۔

”ارے..... رے..... تم یہ تم کہاں جا رہے ہو؟ ابھی تو میں نے بات شروع کی ہے۔“ مدلتا، واصف کے پیچھے دوڑی۔

واصف سیدھا اس طرف جا رہا تھا جہاں وہ اپنی بایک کھڑی کرتا تھا۔ مدلتا اس کے پیچھے آوازیں لگاتی آرہی تھی۔

”ہیلو ہیلو..... ایسکسکو زی ٹیچر..... listen..... ٹیچر“ گھر کا فوجوان ملازم پالتو شین ملی کو گھیر کر گھر کے اندر لے جا رہا تھا، وہ بھی کام بھول کر ٹھنک کر دونوں کی طرف دیکھنے لگا۔

واصف نے پلک جھپکتے میں بایک اشارت کی۔ مدلتا اس کے سر پر پہنچ چکی تھی مگر عین وقت پر نہیں مدد آن موجود ہوئی۔ مین گیت کھلا اور داد دھلی کی بلیک فور چور اندر داخل ہوئی۔

واصف اپنی بایک کی سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے داد دھلی کی گاڑی بھی دیکھ لی تھی مگر اس نے دوسری نظر

بھی گاڑی پر نہیں ڈالی اور بایک کو اسپینڈ دے کر ریس ہو گیا۔ اچانک کھلنے والے گیٹ سے اسے بروقت مدد پہنچ گئی۔ مدلتا اپنی جگہ ہکا بکا کھڑی تھی۔

داد دھلی کی اپنے دماغ کی چٹیں مل چکی تھیں۔ سامنے بڑی، بہن کھڑی تھی اور واصف ان کی گاڑی دیکھ کر بھوک نہیں رکھا۔ بچوں کی طرف ان کا ذہن اس لیے نہیں گیا کہ وہ تو آف ہوتے ہی اپنے، اپنے روم میں بھاگ گئے ہوں گے۔

مدلتا بھی تک خود کو سنبھال نہیں پائی تھیں، بھائی کی اچانک آمد اور واصف کا ریس ہونا وہ بھی اس انداز میں جیسے اسے پیچھے سے دیوچ لے جانے کا اندیشہ ہو۔

داد دھلی گہری سوچ میں ڈوبے آہستہ خرابی سے مدلتا کی طرف بڑھ رہے تھے۔

”میں نے اسے کچھ نہیں کہا داد، وہ ٹائم بہت ضائع کرتا ہے، دونوں بچے موبائل میں لگے ہوتے ہیں اور وہ خود اپنا سیل لیے بیٹھا ہوتا ہے۔ ہم اسے ایک پیئڈز ماماؤنٹ pay کرتے ہیں، ہمارا راسٹ ہے.....“

”پلیز آہا، مجھے آپ سے کوئی justification (وضاحت) نہیں چاہیے، آپ ریٹ کریں، مجھے کچھ پوچھنا ہوگا تو بچوں سے پوچھ لوں گا۔ وہ جس طرح مجھ سے ملے بغیر گیا ہے اس سے یہ تو کفر ہو گیا ہے کہ وہ اب یہاں نہیں آئے گا۔“ یہ کہہ کر داد دھلی، مدلتا کے قریب سے گزر کر اندر کی طرف بڑھ گئے۔

مدلتا ہونٹوں کی طرح کبھی مین گیٹ کو کبھی گھر کے داخلی دروازے کو دیکھنے لگی تھی جسے واکر کے داد دھلی منظر سے اوجھل ہو چکے تھے۔

☆☆☆

ہیلمٹ کچن کا نظریہ رکھتے ہوئے واصف نے اپنے ”لاڈلے تخت“ پر بیٹھی ماں کی طرف دیکھا جو ٹیٹ کا پیلاں قریب سے بجا رہی تھیں۔

”ماں، بہت زور کی بھوک لگی ہے، یوں سمجھیں زخمی گھوڑا ٹھیک کر لایا ہوں۔ میں گھوڑے پر سوار نہیں تھا، گھوڑا مجھ پر سوار تھا۔“ یہ کہہ کر وہ آڑا تر چھا ہو کر ان کے پہلو میں دراز ہو گیا اور دونوں ہاتھ تکیہ بنا کر سر کے نیچے رکھ لیے۔

شمر نے اسے تو اسان جاتے رہے۔

”کیا گھوڑا، گھوڑا لگا رکھی ہے؟ بایک کہاں ہے؟“ شمر حیران پریشان بیٹے کی شکل دیکھنے لگیں جو انکھیں بند کیے پرسکون ہونے کے لیے گہری سانس لینے کی مشق کر رہا تھا۔

”یہ بایک ہی میرا old horse (بوڑھا گھوڑا) ہے ماں۔ CD-70 کھس کر CD-35 ہو چکی ہے اور میں اسے 125 کی طرح ٹھیک کر لایا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے دونوں کانوں کو چھو کر گویا تو یہ استغفار کی۔

شمر کی حیرانی گہرے تفکرات میں بدلنے لگی۔ جب سے واصف نے بایک چلانا شروع کی تھی آج پہلی بار وہ اس حال میں داخل ہوا تھا کہ اپنے آپ میں دکھائی نہیں پڑ رہا تھا، حواس کا نظام بے ترتیب تھا۔

”پہلے میں تمہارے لیے کھانا گرم کرتی ہوں پھر پوچھتی ہوں کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟“ شمر نے تخت سے اترتے ہوئے خود کلائی کے انداز میں کہا۔

”میں بچا کھچا کھانا نہیں کھاؤں گا، اگر کچھ نہیں بنایا تو دو کباب فرانی کر کے سینڈویچ بنادیں، اتنی دیر میں، شمر شاور لے کر فریش ہوتا ہوں۔ اور ہاں.....“ وہ ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے شمر سے مخاطب ہوا۔

شمر پلٹ کر سوالیہ نظروں سے بیٹے کی شکل دیکھنے لگیں۔

”آج کے بعد میں ”ماموں“ کے گھر نہیں جاؤں گا..... جان چھوٹی میری۔“ یہ کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا اور ہاتھوں کو حرکت دے کر ”جم“ والی مشق کرنے لگا۔

”کوئی نئی بات کرو، یہ تم مجھے پہلے بھی کہہ چکے ہو۔“ شمر نے آف موڈ میں اور قدرے اداس ہو کر جواب دیا۔

”میں سالار ماسوں کی بات نہیں کر رہا ہوں ماں، عالی شان کے ”ممو“ کی بات کر رہا ہوں، میں وہی تو نہیں ہوں مگر یہ ”ماسوں لوگ“ مجھے راس نہیں آتے۔ شاید کوئی تایا، چچا ہوتا تو سارے بچے کر جاتے مگر وہ تو قصبہ میں ہی نہیں تھے۔“ داصف ماں کو سمجھوں میں الجھا کر اپنے کمرے تک بول چلا گیا۔

اب شمسہ کو واضح محسوس ہو رہا تھا کہ اس وقت داصف کی ذہنی حالت متوازن نہیں ہے اور جب اس نے عالی شان کے ”ممو“ کی بات کی تو وہ اعزاز نے لگانے کے لیے آزاد ہو گئیں کہ ضرور وہاں کچھ ہوا ہے مگر بے چینی کی انتہا پر انہیں مبر سے کام لیتا تھا۔ ویسے بھی ”شریف بھوکے“ کو آ زمانے سے منع کیا گیا ہے۔

وہ فریڈرک کا دروازہ کھول کر افسردہ نظروں سے شادی کے کھانے کے ڈبے پر دیکھتے ہوئے اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے کباب نکالنے لگیں۔

☆☆☆

فری کو تو یوں لگ رہا تھا کہ اصر کے ساتھ گزارے ہوئے تین گھنٹے تین پل کی طرح گزر گئے۔ بے حد رومانوی ماحول میں کیا جانے والا ڈنر ایک سنہری یاد کی طرح محفوظ ہو چکا تھا۔ آج اصر نے اسے شریک سفر ہونے کا بہت مضبوط احساس دیا تھا۔ اس کی تیاری کو بے حد سراہا تھا۔

رائل بلیو فرائڈ جس پر فیروز زلی ریشم اور نیلے نیس کا کام بنا ہوا تھا اس پر بہت اٹھ رہی تھی، اس پر فیروز زلی رائل بلیو بارڈر والا بڑا سادہ پٹا جو وہ بمشکل سنبھال پار ہی تھی بہت کمال لگ رہا تھا۔ ٹیلم اسٹون لاکٹ، ٹائپس سیٹ نے زینت میں چار چاند لگا دیے تھے۔ سارہ کی سخت ہدایات کے زیر اثر اس نے اصر سے بہت محتاط بات چیت کی تھی۔

اصر اس احتیاط کو تعلقات کا ناموزن تصور کر رہا تھا۔

”ارے۔۔۔ ہمارے گھر تو گیسٹ آئے ہیں۔“ فری نے اپنے گھر کے گیٹ سے باہر فورچوئر سے داؤد علوی کو اترنا دیکھ کر بے ساختہ اعزاز میں کہا۔

اصر نے بھی فورچوئر کے پیچھے اپنی کارروائے ہوئے داؤد علوی کی طرف دیکھا۔

”obviously“ اگلے ہی کوئی لمحے آیا ہوگا، لیٹ آور زمیں کوئی ”ایئر جیسی“ ہوگئی ہے شاید، انگل کی seat ایسی ہے، وہ کسی کو بھی اچانک سے یاد آ سکتے ہیں۔“ اصر نے ہنستے ہوئے چابی تھما کر انجن بند کیا۔ فری نے گاڑی سے اترتے، اترتے پلٹ کر اور مسکرا کر اصر کی طرف دیکھا۔

”ابھی آپ رکیں، میں گیسٹ سے پتا کروں کس سے ملنے آئے ہیں کیونکہ میں ان کو پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔“

”بندہ بڑا شاندار ہے، ویری پنڈت۔“ اصر نے وڈ اسکرین کے پار داؤد علوی کی طرف دیکھ کر سراہنے کے اعزاز میں کہا۔

فری اتر کر داؤد علوی کی طرف بڑھی جو کہیں کی کھڑکی کی طرف جھکے گاڑی سے بات کر رہے تھے۔

”ایسکیمپری سر، آپ پاپا سے ملنے آئے ہیں؟ میرا خیال ہے پاپا سوچے ہوں گے، وہ زیادہ سے زیادہ دس بجے بیڈ پر چلے جاتے ہیں۔“

داؤد علوی نے پشت سے آتی کھٹکتی ہوئی نسوانی آواز کی تو بڑی طرح چونک کر پلٹے۔

”بی بی صاحب، میمان (مہمان) داصف صاحب سے ملنے کو بولتا ہے۔“ گاڑی نے کھڑکی سے گردن نکال کر فری کو مخاطب کیا۔ داؤد علوی کو کچھ بولنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئی۔

”اوہ۔“ اب فری نے از سر نو داؤد علوی کا سر تاپا جائزہ لیا۔ سیاہ ڈنر سوٹ، میرون ویسٹ چیک کی ٹائی، دکتی ہوئی ٹائی پن، ہلکی روشنیوں میں جھمکنی جھمکنی دیتی کھڑی۔

”یہ فورچوئر میں بیٹھ کر آنے والا شاندار سا بندہ اس ”پیارے سے“ داصف سے ملنے آیا ہے؟ کہیں اس بندے

نے بھی داصف سے ”صدقے کے بکرے“ تو نہیں منگائے تھے اور ایک بار پھر داصف کی پاکٹ کٹ گئی ہو۔ اور یہ اپنی رقم وصول کرنے پاپا کے پاس آیا ہو۔“ اس نے سوچا۔

”سر، آپ کو شاید پتا نہیں، داصف یہاں سے شفٹ ہو گئے ہیں۔ اب وہ یہاں نہیں رہے۔“ فری نے بڑا شائستگی سے اطلاع ہم پہنچائی۔

”اوہ، سوری۔“ واقعی مجھے پتا نہیں تھا، وہ۔۔۔ اصل میں داصف کی CNIC کی کاپی میرے پاس تھی، اس میں کرنٹ ایڈریس یہی لکھا ہوا ہے۔“ داؤد علوی خامے چل سے نظر آئے اور فری سے معذرت کی۔

”تو براہم، وہ recently ہی شفٹ ہوئے ہیں ورنہ وہ ہمیشہ سے ہمارے ساتھ ہی رہتے تھے۔“

لفظ ”ہمیشہ سے“ پر داؤد علوی کو فری پر توجہ دینے کی ضرورت پیش آگئی۔ اسی وقت اصر بھی کار سے اتر کر ان کے قریب آ چکا تھا۔

”یہ آپ کا گھر ہے؟“ داؤد علوی نے مصافحے کی نیت سے اصر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ اصولاً جب مرد، عورت پہلو پہلو کھڑے ہوں تو مخاطب مرد ہی کو کرنا ہوتا ہے۔

”جی، یہ میرا گھر ہے، یہ میرے ہر بیٹے ہیں اصر، یہ تو USA میں ہوتے ہیں۔“ فری نے اپنی فطرت سے بموجب جان چھڑانے والے اعزاز میں جواب دیا۔

سوال تو پیدا ہوا تھا کہ یہ لڑکی کا گھر ہے اور وہ اس وقت اپنے ہر بیٹے کے ساتھ ہے جو امریکا میں رہتا ہے مگر داؤد علوی نے بات اختتام کی طرف لے جانا چاہی اور فری سے مخاطب ہوئے۔

”کیا آپ مجھے داصف کا نیا ایڈریس دے سکتی ہیں؟ اصل میں ان کا نمبر بند جا رہا ہے ورنہ میں انہیں کاشیہ کر کے ایڈریس لے لیتا۔“

”مجھے تو خود بھی نہیں پتا، پیچہ کا نیو ہاؤس میں نے ابھی تک نہیں دیکھا۔“ فری کو اب اندر جانے کی جھلک تھی اس کے حساب سے وہ باہر سرنگ پر کھڑی کسی انجینی سے فضول قسم کی بات کر رہی تھی۔

”ایک بندہ یہاں رہتا تھا، اب نہیں رہتا۔۔۔ بات ختم۔“

”تو آئی کو تو پتا ہوگا، آئی سے پتا کر لو۔“ اصر نے ایک ”جنٹل مین“ کو خوار دیکھا تو انسانی ہمدردی کے حصر میں فری کو راستہ بتایا۔

”اوکے، میں ماما سے پتا کر کے آپ کو بھیجتی ہوں۔ اگر ماما کو پتا ہوگا تو وہ پتا لکھ کر سرورٹ کو دے دیں گی۔“

آپ کو دے، دے گا۔“

گارڈ اب کہیں سے نکل کر چوٹا گیٹ کھول کر فری کے اندر آنے کی راہ دکھ رہا تھا۔

”تھیک یو ویری ٹھ۔“ داؤد علوی نے تشکرانہ کہا اور اپنی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر مگر انتظار کرنے لگے۔

”اب آپ یہاں تک آگئے ہیں تو ماما سے قول لیں، کیا پاپا ابھی جاگ رہے ہوں۔“ فری نے اصر کو باہر سے قہقہہ لایا۔

”میں کل آؤں گا فری اور کافی ٹائم انکل، آئی کے ساتھ spend کروں گا، ابھی تو کافی لیٹ ہو گیا۔“

آئی قارملیٹر میں پڑ جائیں گی، بکل ملتے ہیں، گڈ نائٹ۔“ اصر نے ماحول کے پیش نظر فری کو چھوٹنے کے بجائے صرف ہاتھ لہرانے پر اکتفا کیا۔

دونوں کو اس بات کا احساس نہیں تھا کہ ایک پریشان حال شریف آدمی داصف کے ایڈریس کے انتظار میں ایک، ایک پل گن رہا ہے۔

داؤد علوی دیکھ رہے تھے کہ فری خراں، خراں اور اندر چارہ جی اور اندر مڑ، مڑ کر دیکھ رہا تھا۔
 ”نیا شادی شدہ کھل لگ رہا ہے۔“ وہ سوچ رہے تھے۔

☆☆☆

”ہیں..... انہر کو اندر آنے کے لیے نہیں بولا؟“ سارہ جولاؤنج میں فری کے انتظار میں کھاک پر نظر جمائے
 بیٹھی تھیں، اسے تجا اندر آتے دیکھ کر حیران ہوئیں۔

”وہ کل آئیں گے، کہہ رہے تھے کہ آئی اور انکل کا بیڈ ٹائم ہے، کل آکر ان کے ساتھ کافی ٹائم spend
 کروں گا۔“

”چلو خیر، ٹھیک ہے، وہ خود بھی تھکا ہوا ہوگا اور.....“ اس سے جو شتر وہ مزید کچھ کہیں، فری نے ٹوک دیا۔

”ایک منٹ..... ایک منٹ..... باہر کوئی اس ڈفر سے ملے آیا ہے۔ ان کے پاس پچھو کے new house کا
 یڈریس نہیں ہے، ذرا آپ انہیں سمجھا دیں، پتا نہیں کیا مسئلہ ہے، ایک جمنٹل میں اتنی رات کو پریشان پھر رہا ہے۔
 اس کا تو کام ہی ہے فضول میں لوگوں کو پریشان کرتا ہے۔“ فری نے اپنا کچھ صوفے پر دے مارا اور پاؤں سینڈل
 سے آزاد کرنے لگی۔

سارہ حیران پریشان فری کی شکل تک رہی تھیں۔

”تو کیا وہ صاحب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں؟“ وہ شکر اعزاز میں اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئیں۔

”میرا دماغ خراب ہے کہ ایک stranger (انجینی) کو ڈرائنگ روم میں لا کر بٹھا دوں؟“ فری چڑ کر
 کہہ رہی تھی۔ ایک خواب پرور ملاقات عجیب سی بد مزگی پر تمام ہوئی تھی۔

”باہر اپنی لگژری گاڑی میں بیٹھ کر wait کر رہے ہوں گے۔“

”خود ہی تو کہہ رہی ہو کہ کوئی شریف آدمی ہے، داصف سے ملے آیا ہے تو ہمارا ہی گیٹ ہوتا ہے۔“ سارہ
 اب جلت کے انداز میں آگے بڑھتے ہوئے بولتی جا رہی تھیں۔

”فضول میں ہمارا گیٹ ہو گیا، جان چھوٹی ہماری، اب ہم اس کے گیٹ بھی بھٹکتا ہیں۔“ وہ بڑبڑاتی تھی مگر
 اتنی دیر میں سارہ لاؤنج سے باہر نکل چکی تھیں۔ رات اپنے عروج پر پہنچنے جا رہی تھی اور کوئی داصف کو ڈھونڈتا پھر رہا
 تھا، پریشانی کی بات تو تھی۔

فری نے تھکے، تھکے انداز میں ہاتھ بڑھا کر اپنا کچھ اٹھایا تاکہ اپنا سہل فون نکال کر میسج وغیرہ چیک کرے، ساتھ
 ہی وہ داہلی رستے کی طرف بھی آف سوڈ میں دیکھ رہی تھی کیونکہ اس ”ڈفر“ نے اس کی ماں کو کام سے لگا دیا تھا۔

☆☆☆

داؤد علوی بڑی بے چینی سے بار بار اپنی کلائی پر ہنسی گھڑی تھا وقت دیکھ رہے تھے۔ کہیں وہ لڑکی اندر جا کر
 بھول تو نہیں گئی؟ انتظار کی شدت کا خاصہ ہے کہ اچھے بھلے انسان کو وہ ہوں میں الجھا دیتی ہے۔ مگر ان کی جان میں

جان آئی اور گیٹ کا ڈیڑواڑہ کھلا اور انہوں نے ایک نفس، طرح دار خاتون کو گیٹ سے باہر سر نکال کر جھانکتے پایا۔

اب ان پر لازم تھا کہ اخلاقی طور پر خاتون کو مزید مشقت سے بچائیں۔ یہ بھی ان کی بڑی مہربانی تھی کہ کسی
 نوکر کو پیغام رسائی پر مقرر نہ کر کے ان سے کا وقت بچا رہی تھیں ورنہ تو بیگمات اس طرح کا رسک سہی ہی نہیں ہیں۔

انجینی ملاقاتی تو اکثر بے وقوف ہو جاتے ہیں۔
 وہ بڑی سرعت سے اپنی شاندار گاڑی کا دروازہ کھول کر سارہ کی طرف لپکے اور پہلے سلام کیا۔

”بہت معذرت بیگم صاحبہ، میں نے آپ کو بہت زحمت دی مگر داصف سے بہت ضروری کام پڑ گیا ہے، اس
 سے ملے بغیر تو مجھیں میرے سارے کام اب رکے ہوئے ہیں۔ آئی ایم سوری، مجھے پہلے اپنا تعارف کرانا چاہیے،

بس اس وقت ذہنی کیفیت اس طرح کی ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ میرا نام داؤد علوی ہے، داصف میرے گھر میرے
 بھانجوں کو ٹیوشن دیتے ہیں۔ تقریباً روزی میرے گھر آتے ہیں بلکہ کبھی، کبھی تو سڑے کو بھی چھٹی نہیں کرتے۔“
 رات کی پچھلی گھڑی سانی میں سارہ کا دل پیچھے ڈوبنے لگا۔

”اس..... اس سے کوئی ملتی ہوگی ہے؟“ سارہ کی آواز اندیشوں کے اثر سے لرزے لگی، وقت اور ماحول
 ہی ایسا تھا۔

”ارے نہیں، غلطی تو شاید ہم سے ہوئی ہے، وہ تو بہت مذہب نوجوان ہے بلکہ میں سمجھتا ہوں ماں نے بہت
 اچھی تربیت کی ہے۔ میں اس سے بہت خوش ہوں۔“ داؤد علوی نے فوراً وضاحت کی بلکہ اگلے شرمندہ ہو گئے کہ آپا
 کی جذباتیت نے اس وقت کتنے شریف لوگوں پر وقت ڈال دیا ہے۔

”پھر؟“ سارہ کو بے ساختگی سے لگی وضاحت نے پُر سکون کر دیا، دل کے کسی گوشے سے مدھم مدھم ابھری۔

”کاش اس وقت سالار بھی مہمان کے یہ کلمات سننے، شاید بھڑکے الاؤ مجھے پڑ جاتے۔“

”میں آپ کی پریشانی دیکھ کر اس بات پر حیران ہوں کہ آج کے دور میں آپ ہر کسی سے ایک کال کی دوری پر
 ہوتے ہیں، آپ نے اپنے ٹیوٹر سے کالمیکٹ کیوں نہیں کیا؟“

”اس کا سہل آف ہے، آپ کے آنے سے پہلے بھی میں نے چیک کیا تھا۔“ داؤد علوی نے بڑی شائستگی سے
 جواب دیا۔

”اوہ، میں آپ کو اس کی مدد کا کالمیکٹ نمبر دے سکتی ہوں۔“

”جو میں آپ سے ہرگز نہیں لوں گا۔“ داؤد علوی کا جواب بر جستہ تھا۔

چند ثانیے کے لیے سارہ ٹھٹکی سی گئیں پھر فوراً ہی راہ سو جھٹی۔

”میں بات کرتی ہوں، وہ داصف سے آپ کی بات کرادیں گی۔“

”یا تو میں ڈائریکٹ اس کے گھر جاؤں گا یا ڈائریکٹ فون پر بات کروں گا۔ بہت معذرت ہم، میں اس وقت
 صرف اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو کوئی ٹک ہے تو میں آپ کو اپنا ڈرائیونگ کارڈ دے رہا ہوں۔“ داؤد علوی
 کوٹ کی جیب سے اپنا والٹ نکالنے لگے۔

”اوہ پلیز، مجھے شرمندہ نہ کریں..... بلکہ مزید شرمندہ نہ کریں۔ آپ کو تکلفا بھی اندر تشریف لانے کے لیے
 نہیں کہا..... کیونکہ..... مجھے لگا آپ بہت جلدی میں ہیں۔ آپ مجھے اپنا ڈرائیونگ کارڈ ضرور دیجیے، میں اندر جا کر
 آپ کو داصف کے گھر کی لوکیشن send کر دیتی ہوں۔“

سارہ بہت محتاط انداز میں بات کر رہی تھیں، گاڑی بھی اپنی کن کا بندھے پر لٹکائے سارہ اور داؤد علوی کے
 اریب قریب ہی ٹھہر رہا تھا بلکہ کسی تفتیشی افسر کی طرح وقفے، وقفے سے ٹھٹکی بانٹ کر داؤد علوی کو گھورنے لگتا تھا
 کیونکہ داؤد علوی گھر کے کینوں کے لیے ہی نہیں، گاڑی کے لیے بھی سو فیصد انجینی تھے۔ داؤد علوی نے اپنا مفرد سا
 فائل نما چھوٹا سا کارڈ سارہ کی طرف بڑھایا۔

”میں داصف کی مامی ہوں۔“ سارہ نے کارڈ لیتے ہوئے چھوٹا سا تعارف بھی کر دیا۔

”جی، مجھے اندازہ ہو گیا تھا کیونکہ آپ کی صاحبزادی داصف کی مدد کو پچھو کہہ رہی تھیں۔“

”اس نے کھڑے، کھڑے اتنی ساری باتیں کر لیں؟“ سارہ نے سوچا مگر کچھ بولے بغیر شائستگی سے ہاتھ کے
 اشارے سے خدا حافظ کہہ کر گھر کے اندر چلی گئیں۔

داؤد علوی اپنی شاندار گاڑی میں بیٹھ کر سرد و نظر آئے کہ کیا اس وقت داصف کے گھر جانا مناسب ہوگا؟

”ہاں، بعض اوقات پانچ منٹ کی تاخیر کی وجہ سے آپ پریشنا کام بھی ہو جاتے ہیں اور میا دلوا جھین بھی
 اشارے سے خدا حافظ کہہ کر گھر کے اندر چلی گئیں۔“

داؤد علوی اپنی شاندار گاڑی میں بیٹھ کر سرد و نظر آئے کہ کیا اس وقت داصف کے گھر جانا مناسب ہوگا؟
 ”ہاں، بعض اوقات پانچ منٹ کی تاخیر کی وجہ سے آپ پریشنا کام بھی ہو جاتے ہیں اور میا دلوا جھین بھی

سوچے رہ جاتے ہیں کہ صرف پانچ منٹ کی تاخیر ہی تو ہوئی تھی۔ وہ ایک عذاب اپنے سر پر لا کر میرے گھر سے نکلا ہے، جان بچانے کے سر ملے ہوں تو دن رات کی بحث نہیں چھیڑی جاتی۔“

انہوں نے سیل فون سامنے رکھ دیا تاکہ سٹیج نوٹیفکیشن ملتے ہی راستہ سیدھا کریں۔ اندر کی بے قراری سے نجات پانے کے لیے پرانی غریبیں play کر دیں۔ فریدہ خانم کی آواز کے جھرنے پہنے لگے جس کا آخری شعر تو داد و غلو کی ساری زندگی سمیٹ لیا تھا۔

ایک اور دریا کا سامنا تھا۔ منیر مجھ کو

میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

اسی لمبے موہاں کی اسکرین روشن ہوئی، انہوں نے جلدی سے فون اٹھا کر دیکھا۔ سارہ نے لوکیشن بھیج دی تھی اور یہ منزل کا سنگ میل تھی۔

لوکیشن سے انہوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ اس وقت وہ صاف روڈ پر ڈرائیو کریں گے۔

☆☆☆

”کوئی خوشی راس ہی نہیں آتی ماں، لاسٹ سٹڈے کو علوی صاحب کہہ رہے تھے کہ میں تم سے بہت خوش ہوں، مجھے لگ رہا ہے کہ میں تمہاری محنت کا پورا حق ادا نہیں کر رہا، آئندہ سے تمہیں میں نہیں چالیس ہزار pay کروں گا۔ ماں، اتنا حوصلہ کوئی، کوئی کرتا ہے، لوگوں کا تو بس نہیں چٹا کہ ٹیوٹر کو صرف بائیک میں پیٹرول ڈلوانے کے پیسے دیں۔ دس گھر دیکھے ہیں میں نے، level بڑھانے والے ٹیوٹر کو کہتے ہیں کہ ایک ٹھیکٹ کے پانچ ہزار بہت ہوتے ہیں، میں انکار کر کے آ جاتا تھا۔“ کھانا کھا کر واصف نے جی بھر کر اس نکالی۔ سہاگنے تو پانچ منٹ میں اس کے سر کی دی جمادی تھی، میں منٹ بعد تو اسے خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اس کا اپنا دینی توازن بھڑکنے کا خطرہ ہے پھر تو وہ جھٹ بھاگا۔

”تم کہہ رہے ہو بہت بن ٹھن کر رہتی ہے، حلے سے بیگم صاحب لگتی ہے مگر باتیں پاگلوں والی کرتی ہے۔“

شرمہ بھی بہت الجھ رہی تھیں اس لیے کہ واصف بہت بے سکون تھا۔

”باتوئی عورتیں پاگل ہی لگتی ہیں، بس میڈم کو بولنے کا بہت شوق ہے۔ اب ایک ٹیوٹر کا کیا لیتا دیتا ہے کہ اس کی طلاق ہوئی، بس کا نکاح ہوا، ”صدف کتنی“ کون ہے؟“ واصف نے اٹھ کر تیز روشنی گل کردی اور پھر ماں کے تحت پر دراز ہو گیا۔

شرمہ ہٹا کر واصف کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

”صدف کتنی.....؟“

اس قسم کے الفاظ تو نہ کبھی شرمہ نے واصف کے سامنے بولے تھے نہ سارہ نے کبھی غلطی سے منہ سے نکالے تھے۔ واصف کے منہ سے لفظ ”کتنی“ سن کر ایسا ہی لگا گویا کوئی تین سال کا تو لپچ پراٹھے کو ”تاتا“ بول رہا ہو۔

”یہ ایلٹ کلاس کی عورتیں بھی ”کتنیوں“ کو اتنی اہمیت دیتی ہیں؟“ تعجب ہے۔“ آخری الفاظ بڑبڑاہٹ میں دھل گئے۔ بے اختیار اپنا ہاتھ واصف کے بازو پر رکھ دیا۔

”ماں، عورت بس عورت ہوتی ہے، یہ کلاس ولاں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ ذرا ایٹ پر جا کر اپنی مرحوم سسر کی بہن کی چیک کریں۔“ واصف نے جھلا کر جواب دیا۔

”مم..... میری مرحوم بہن؟“ شرمہ تو ایک طرح سے خوفزدہ سی ہو کر واصف کی طرف دیکھ رہی تھیں کہ لگتا ہے اس عورت کے پاگل پن کا کچھ زیادہ ہی اثر لے لیا ہے۔

”پرس ڈیانا کی بات کر رہا ہوں، اگلوئی سنداس سے جیلس تھی، ساس کو اس کی ہر بات پر اعتراض تھا، ساس

کی ماں نے تو اسے محل چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔“ واصف نے اب شرمہ کی طرف سے کروٹ لے لی تھی۔ شرمہ نے اس کی کمر پر ایک دھپ رسید کیا۔

”تو تم میٹ پر یہ بچا نہیں دیکھتے ہو، اتنا نمل جاتا ہے؟“

”ماں، آپ کے پاس بھی سیل فون ہے ناں، آن کرنے کی دیر ہے، پتا نہیں کون، کون اپنا سو پیچھے آ جاتا ہے۔ ایک بچہ پر بڑبڑا، اس کے لیے باغیچہ کرنے کی ضرورت نہیں۔“

یہ ایک سیاہ و سفید صورت حال تھی، شرمہ کو لا جواب ہونا پڑا۔ اس سے جو شکر کہ وہ اسے سمجھا بھجا کر صبح کے کام یاد دل کر سونے کے لیے لیجیں ڈیمک ڈانک ٹبل نے ماحول کا تاثر ہی نیکھت تبدیل کر کے رکھ دیا۔

”میں دیکھتی ہوں، میرے خیال میں نائٹ شفٹ والا کھانا لینے آیا ہوگا۔ دوپہر کو میں نے عبدالقادر سے کہا تھا کہ رات والے گارڈ کو کھانا لینے بھیج دینا، تم نے تو چکھائی نہیں، ویسے کاوریسا ہی رکھا ہوا ہے۔“

تخت سے داخلی دروازے تک پہنچے، پہنچے ان کی بات مکمل ہو چکی تھی پھر بھی احتیاط کے ضمن میں وہ آنے والے کی شناخت کرنا ضروری سمجھ رہی تھیں۔

”کون ہے؟“

”بیگم صاحب، نیچے ریسپشن میں آپ کا سیمان (مہمان) ہے، بولتا ہے واصف صاحب کو ملنے آیا ہے۔“ دروازے کے عقب سے رات کے گارڈ دلاور کی آواز لاؤنج میں گونجی تو واصف ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ شرمہ نے بھی ابھی نظروں سے پلٹ کر واصف کی طرف دیکھا۔

”نام نہیں پوچھا سیمان کا؟“ شرمہ اب تھوڑا دروازہ کھول کر گارڈ سے مخاطب تھیں۔

”علوی نام بولتا ہے۔“ گارڈ نے گویا دھماکا کیا۔

واصف ایک جست میں دروازے تک پہنچا۔

”ایک منٹ ماں، راستہ دیں، میں علوی صاحب کو اوپر لے کر آتا ہوں۔“

شرمہ چند لمحوں تو سوچنے بچنے کی صلاحیت سے ہی فاذرغ ہو گئیں، حیران پریشان بس ادھ کھلے دروازے کی طرف ہی تکتی جا رہی تھیں جہاں سے واصف پلک جھٹکے میں اوجھل ہو گیا تھا۔

☆☆☆

”افوہ..... بتا تو دیا، فری نے بتایا تھا کہ کوئی بندہ اکیلا ہے، واصف سے ملنے آیا ہے۔“ سارہ قدرے جھلا کر کہہ رہی تھیں۔

”یہ کوئی وقت ہے، گھر سے باہر جا کر کھڑی ہو گئیں۔ پتا بھی ہے آج کل لوگ کن حالات میں زندگی گزار رہے ہیں۔“ سالار صاحب پر خند اور تھکاوٹ کا غلبہ تھا۔ وہ فری کے انتظار میں زبردستی جاگ رہے تھے، یہ سوچ کر کہ کبھی بھی وقت سارہ آ کر بتائیں گی کہ فری آگئی ہے اور وہ کروٹ لے کر سو جائیں گے۔

مگر سارہ نے جب یہ بتایا کہ فری تو چندرہ میں منٹ پہلے آگئی تھی، وہ تو کسی اجنبی مہمان کو آسانیاں فراہم کر رہی تھیں۔ حالات خواہ کچھ ہوتے وہ یہ بات تو لازمی سالار صاحب کو بتانے کی پابند تھیں کہ واصف کے حوالے سے کوئی خبر بھی سالار صاحب سے نہیں چھپائی چاہیے جبکہ آنے والا اجنبی مہمان ایک اچھی حیثیت کا مالک تھا۔

”کوئی کام ڈال کر آگیا، ہو گا کسی شریف آدمی کے سر..... ورنہ اس کی اپنی کیا حیثیت ہے جو لوگ اسے راتوں کو ملنے آئیں۔“ سالار صاحب نے پھر بڑبڑاہٹ کے اعجاز میں سوال کیا، یوں بھی موڈ خراب کرنے کے لیے واصف کا نام ہی کافی تھا۔

”لگتا ہے آپ سچ نیچر میں ہیں، میں نے شروع ہی میں یہ بتا دیا تھا کہ واصف ان کے بچوں کو ٹیوشن دیتا

ہے۔" سارہ بھی بے حد شکی ہوئی تھیں، نہ چاہتے ہوئے بھی جھلا کر جواب دے رہی تھیں۔
 "ہاں تو کام ڈھنگ سے نہیں کیا ہوگا، بچوں کا رزلٹ خراب آیا ہوگا اس لیے اسے کھری، کھری ستانے آئے ہوں گے موصوف۔"
 سارہ کے اندر کچھ کہنے کا جذبہ تو مجھ کا مگر یہ سوچ کر خاموش رہیں کہ اس وقت سالار صاحب حالت نیند میں زہر اگل رہے ہیں، چپ چاپ شب خوابی کا لباس بدلنے ڈریسنگ کی طرف بڑھ گئیں۔
 "اب ساری دنیا سالار صاحب تو نہیں ہے جو واصف کو کھری، کھری ستانے کے بہانے ڈھونڈتی رہے۔" وہ سوچ رہی تھیں۔

☆☆☆

"علوی صاحب، آپ معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔" واصف عجیب طرح کی صورت حال سے دوچار تھا۔ دوبارہ اس گھر میں نہ جانے کا قطعی و حتمی فیصلہ بھی کر چکا تھا اور داؤد علوی کے رویتے کے سامنے بے بسی بھی محسوس کر رہا تھا۔ شمسہ کافی اور کچھ ڈرائی فروٹ بھی لے آئی تھیں حالانکہ موسم سرد نہیں تھا مگر انہیں خالی کافی سے مہمان کی تواضع کرتے ہوئے شرمندگی ہی محسوس ہو رہی تھی۔ کئی دنوں سے گروہری بھی نہیں لی تھی جس کے ساتھ لیٹ، نمکو وغیرہ بھی آجاتے تھے۔

داؤد علوی تو چائے، کافی کا بھی منع کر رہے تھے مگر واصف کے بے حد اصرار پر انہوں نے کافی پینے کی ہامی بھری تھی۔ "میم، میں آپ سے بھی بہت شرمندہ ہوں۔ میری سسڑی وجہ سے آپ دونوں کو تکلیف پہنچی اور میں نے آپ کو بے وقت ڈسٹرب کیا۔۔۔۔۔۔ مگر واصف جس انداز میں گھر سے نکلا تھا مجھے یقین ہو گیا تھا کہ آج نہ میں ٹھیک سے سو سکوں گا اور نہ واصف۔" داؤد علوی کی پلٹیں شرمندگی کے بوجھ سے بو جھل ہو رہی تھیں۔

"آپ سے ایک سوال کر سکتا ہوں سر؟ پلیز مائنڈ مت کیجیے گا۔" واصف نے قدرے ہچکچاتے ہوئے پہلے داؤد علوی کی طرف پھر شمسہ کی طرف دیکھا، شمسہ نے نظر بچا کر اسے مخاطب رہنے کا اشارہ دیا کیونکہ انہیں خود اندازہ نہیں تھا کہ واصف کیا سوال کر سکتا ہے۔

"سر، آپ ان کی proper ٹریسٹ کیوں نہیں کراتے؟ آخر یہ ان کا right ہے۔"
 واصف کے سوال پر ایک اداس سی مسکراہٹ داؤد علوی کے ہونٹوں پر کھلنے لگی۔
 "جب وہ اپنے شوہر کے گھر میں تھیں، ٹریسٹ تو وہیں شروع ہوئی تھی۔ اصل میں..... غیر ذمے دار انسان کو شادی ہی نہیں کرنی چاہیے۔" یہ کہہ کر داؤد علوی نے کافی کاٹ اٹھا کہ گہری سانس لی۔ ماں، بیٹا اب خاموش سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"میری آپا بہت خوب صورت اور ویل انجیو کیڈ تھیں، ایسے میں عورت خود پسند بھی ہو جاتی ہے۔ ایسی عورت کا شوہر اگر معمولی اور عام سی خواتین کو اس پر فوقیت دے تو وہ شدید اسلٹ محسوس کرتی ہے، بس دولت کی زیادتی میرے بہنوئی کو ان راستوں پر لے گئی تھی جہاں منزلوں پر قافلے لٹ جاتے ہیں۔" داؤد علوی نے بڑا فلسفیانہ جواب دیا تھا۔ شمسہ نے بلا ارادہ داؤد علوی کی طرف دیکھا۔

"اوہ..... یہاں ایک ہے..... وہاں دو ہیں۔" انہوں نے نظر بچا کر واصف کی طرف دیکھا۔
 "کوئی بھائی یہ پسند نہیں کرتا کہ لوگ اس کی بہن کو "طلاق یافتہ" کے ٹائٹل سے یاد کریں اسی لیے میں نے خود ان کی ٹریسٹ کی ذمے داری اٹھائی کیونکہ ان کے شوہر نے علاج پر خرچ کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ یہ میری لاکھوں روپے کی کراہی اور پلازما اسکرین توڑ چکی ہے، اس نے پورا ایک پیکٹ ڈالرز کا برز پر رکھ کر چلایا ہے، کار کی ونڈ اسکرین بچوں کے bat سے توڑی ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے مجھے کئی بار شکر ادا کرنے کا کہا کہ شکر کرو میں نے اتنا

نقصان برداشت کیا اور تمہاری بہن کو شتم نہیں کیا۔ طلاق تو بہت چھوٹی بات ہے۔"
 یہاں داؤد علوی رک کر ایک بجلی سی اداس سی آنکھیں اٹھائیں اور کافی کا سپ لینے لگے۔
 "تو آپ نے ان سے یہ نہیں کہا کہ غور کریں، یہ ایسا کیوں کرتی ہیں؟ شادی کے وقت ٹھیک تھیں جب ہی تو شادی ہوئی تھی۔"

شمسہ کو اپنا بہت کچھ یاد آنے لگا، لاشعوری طور پر ایک ان دیکھی عورت کے لیے بے پناہ دکھ محسوس کیا۔
 "گمبھڑوٹھنے سے پہلے بہت باتیں ہوئی تھیں میم، جن کو اب دُہرا نا فضول ہے۔" داؤد علوی نے گہری سانس لے کر بہت زور سے اپنی آنکھیں بند کر کے کھول دیں۔ وہ شمسہ کے سامنے بہت محتاط لگھو کر رہے تھے، ان کے سامنے ایک سادہ سی خاتون جو حجاب کے انداز میں بڑا سادہ پنالے ٹی شرتی تھی ان کو نگاہ نیچی رکھ کر بات کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اتنی دیر میں انہوں نے ایک بار بھی شمسہ کی نظروں میں نہیں جھانکا تھا۔

"میں بہت کچھ سمجھ گئی ہوں اور واصف کی طرف سے وعدہ کرتی ہوں کہ واصف اپنی کسٹنٹ پوری کرے گا، بچوں کے فائل انگریز ام تک ان کے ساتھ ہے، بس آپ ماحول provide کریں۔" شمسہ کا اندازہ تھا کہ واصف اس وقت فیصلہ سازی کے تقاضوں سے بہت دور ہے اور رات کے اس پہر بات کو میٹھنے کا راستہ اختیار کرنا چاہیے جبکہ شمسہ کی بات پر واصف نے ابھی ہوئی نظروں سے ماں کی طرف دیکھا بھی تھا۔

"ٹھیک ہو پوری ہو..... لیکن مجھے اور آپ کو واصف پر پریشانی نہیں ڈالنا چاہیے۔"
 "جی..... سر..... میں تمہارا سا سوچ کر جواب دوں گا۔ پلیز، آپ مجھے تمہارا سا وقت دیں۔" گویا واصف نے ایک طرح سے شمسہ کی بات کو غیر موثر بنادیا تھا جس پر شمسہ نے اچھی خاصی بے چینی و شرمندگی محسوس کی تھی۔
 "میں سمجھ رہا ہوں، مگر میں ایک solution ساتھ لایا ہوں، وہ آپ پر ہے کہ آپ اتفاق کریں یا انکار کر دیں۔"
 شمسہ اور واصف قدرے منتظر دکھائی دیے مگر خاموش رہے اور داؤد علوی کے بولنے کا انتظار کرنے لگے۔
 "اگر آپ کی روٹین ڈسٹرب نہ ہو تو عالی شان اور عالی جاہ آپ کے گھر آسکتے ہیں، ان کے پاس کار بھی ہے اور ڈرائیور بھی۔"

تجویر معقول تھی مگر گھر میں وقت کا تعین کرنا بھی ایک کام تھا کیونکہ شمسہ کے اپنے لگے بندھے معمولات تھے۔ وہ واصف کی طرف دیکھنے لگیں جو خود بھی تڑو میں بڑ گیا تھا۔
 "ٹھیک ہے، آئیڈیا تو اچھا ہے، مجھے فوراً بھی کر رہا ہے لیکن میں کل ہی آپ کو حتمی بتا سکتا ہوں۔"
 "اوکے جنٹلمن، اب مجھے اجازت..... اب آپ بھی سکون سے سوئیں اور میں بھی فل ریسٹ کروں گا۔" داؤد علوی نے یکفخت سیٹ چھوڑ دی۔

"یار، گھر بدلا تھا تو کم از کم مجھے تو بتا دیتے، میری وجہ سے بلاوجہ کچھ شریف لوگ ڈسٹرب ہوئے۔" داؤد علوی نے مصافحہ کرتے ہوئے بایاں ہاتھ بڑی اپنائیت سے واصف کے دائیں شانے پر رکھ کر دیا۔
 "آپ وہاں کس سے ملے؟" واصف کی آنکھوں کے تاثرات بدلنے لگے۔
 "بھئی وہ تمہاری تنی شادی شدہ..... کزن اپنے بزنس کے ساتھ واپس اپنے گھر آئی تھی، اسٹائل سے تو

بھی لگ رہا تھا کہ....."
 "اوکے..... رائٹ سر..... چلیے..... میں آپ کے ساتھ نیچے چلتا ہوں۔" شاید پہلی بار واصف نے داؤد علوی کو بڑی جرأت سے جملہ مکمل کرنے سے روک دیا۔ پلک جھپکنے کے دورانیے سے بھی کم عرصے کے لیے داؤد علوی نے واصف کی طرف دیکھا پھر سینے پر ہاتھ رکھ کر مودبانہ انداز میں شمسہ کو گویا خدا حافظ کہا اور آگے بڑھ گئے۔
 واصف نے بیرونی کی۔

شہر خالی، خالی گھوڑوں سے کافی گگ کی طرف دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھیں جو کچھ دیر پہلے واکوٹولی کے ہاتھوں میں تھا۔

”بہن کی تو سنادی..... یہ شریف آدمی خود بھی تو اکیلا ہے۔“

☆☆☆

”میرے بچے رکھو

کیا ہوا ہے ٹیلا فون

تمہاری یاد دلاتی ہے

جیسا آگ لگاتی ہے“

جینیلی خواجہ سرائے سردار ہاتھوں سے تالیاں بجا کر اپنی بیٹے ہانس جیسی آواز میں اپنی دانست میں گنگنا رہا تھا، ساتھ ہی سامنے رکھا ہوا بھی گڑگڑا رہا تھا، بہت خوشگوار موڈ میں دکھائی دے رہا تھا۔

”گرو جی، آپ تو خود دس زبانوں کے پتہ لگتے ہو، کسی ماں کے لعل میں اہمیت ہے جو آپ کا بیٹا بن کر دکھائے۔“

ستارہ نے شیشے کی رکابی میں رکھا پان کا بیڑا جینیلی کو پیش کرتے ہوئے جان کی امان چاہی۔

”اللہ نے تجھے اپنے بہن میں رکھا، ایک دم سیدھ میں بناتا تو نواب نظام دین کو نہ ہر دے کر ان کی دعو (بیوہ) سے نکاح پڑھا لیتا۔ ایک ذرا سائریا کی یاد میں گانے بھی، تنک حرام نے نوک لگا دی۔ تیری ننھوں ہائے نے میرے بچے کا گلا بٹھا دیا۔ شریف الدین کی پوری نظر ہے۔ معصوم کل ساری رات اسپتال میں اپنی مٹی موم بتی کے ساتھ رہا۔“

جینیلی نے پہلے ستارہ کی خاطر خواہ تو اس صبح کی پھر زین کو یاد کرنے لگی۔

”موم بتی..... تو تم ٹھیک ہوئے گرو جی۔“

”نہی می..... نہ اماں..... نہ امی جان..... مو..... و..... م.....“ ستارہ خواجہ سرائے سے ”نہیں، نہیں“ کی آوازیں نکال کر فیس رہا تھا۔

”بہت بڑے مگر بڑی اسکول میں پڑھتا ہے میرا شہزادہ۔“ جینیلی کے لہجے میں محبت کی علامت تھی۔

”گرو جی! ابھی، ابھی میں سوچتی ہوں.....“

”جینیلی کی طرح تیری زبان چلتی ہے، تجھے سوچنے کا ٹیم مل جاوے؟“ جینیلی نے لٹاڑتے ہوئے حیرت مگڑا لیا اور ستارہ اپنا سامنے لے کر بٹھل دیا۔

”روز کتنے جے اللہ کو پیارے ہوؤں، اس رئیس بڑھی کو بھی اپنا پیار اٹھانے میرے سوچنے والے..... جان پھوڑے میرے زین کی عزت کے کی دیکھ پراڈو ہا بن کر بیٹھی ہے۔“ جینیلی اب اس تو اتر سے حیرت مگڑا رہا تھا گویا کسی جھٹکشن سے دوچار میرے جھگڑوں میں زین طوفانی رفتار سے گزر رہی ہو۔

☆☆☆

فری زین سے ملنے بلکا اپنے نکاح کی مٹھائی دے آئی تھی۔

”اس لڑکی کو اب روکو، کیا کرنے آئی ہے؟ میرے گھر میں اب اس سے کوئی ملے نہیں آئے گا، کالج کی دو مٹھائیاں کالج تک دیکھیں۔“ ٹمین نے عرشہ کے بیڈروم کے دروازے کے پھول چاک کھڑے ہو کر ایک نادر شاہی فرمان جاری کیا۔

”مئی، زین کے فریڈز کے آنے سے آپ کو کیا فرق پڑ رہا ہے؟“ عرشہ نے ٹمین کی شکل دیکھ کر رہی تھیں۔

”اور فری تو بس کچھ دنوں کی مہمان ہے پھر تو وہ USA چلی جائے گی، نکاح ہو گیا ہے، کسی وقت رخصتی بھی ہو جائے گی۔“

عرشہ کو درحقیقت ٹمین کے اس اعتراض کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ ٹمین نے ٹمین کو کال کرنے کے بتایا تھا

کہ عرشہ نے اپنا سیل آف کیا ہوا ہے، مامرنے ہانپیں مانی ہے، وہ عرشہ کے ساتھ ایک میٹنگ کرنا چاہتا ہے۔ اس کال کے بعد ٹمین کا بلڈ پریشر کنٹرول ہی نہیں ہو رہا تھا۔

”اب میں تمہیں بتاؤں کہ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے یا ہم نے اپنے ساتھ کیا، کیا ہے۔ پرانے وقتوں میں جب کسی کو کوئی ٹم، بریشانی نہیں ہوتی تھی وہ ”بکری“ ہانڈھ لیتا تھا گھر میں، ہم نے اس کے الٹ کیا۔ ٹم ہم سے چور تھے اور ہم نے ایک ”بکری“ ہانڈھ لی۔ تم اس کے پیچھے چلو گی، یہ تمہاری منزل بتائے گا، یہ تمہارے فیصلے کرے گا؟ ماں مر گئی ہے تمہاری؟“ ٹمین بڑی طرح پھٹ پڑیں۔

”مئی، پلیز آہستہ ہو، گھر میں فری موجود ہے۔“ عرشہ نے فوراً اٹھ کر ٹمین کو شانوں سے تمام لپٹا لیا کہ یہاں سے انہیں بیڈروم تک چھوڑ آئیں یا ان کے کمرے میں ہی ان سے بے بھادگی سن لیں۔

”تم نے سیل فون کیوں آف کیا ہوا ہے؟ کس سے ڈر رہی ہو..... اس بے نام دشمنان سے؟ کیا اوقات ہے اس کی..... میں اپنی اس لفظی پر تمہارے مرحوم باپ سے شرمندہ ہوں، وہ شاید اس ”بیونڈ کاری“ پر مجھے بھی معاف نہ کرے۔“ ٹمین نے ہر فرد کی شکل کے عالم میں عرشہ کا بازو اپنے کانڈھے سے ہٹا دیا۔

”پھر وہی بات..... اس کی جو بھی اوقات ہے اس نے خود سے بدلنے کی کوشش نہیں کی تھی، اس کا اسٹینس ہم نے سیٹ کیا ہے مئی، میں اپنی خوشیوں کے لیے اس کی جان نہیں لے سکتی۔ آپ بھی realistic ہو کر پھوٹیشن کو own کریں۔ انسان گھر میں Pets بھی پالتا ہے تو ان سے محبت ہو جاتی ہے، وہ تو پھر انسان کا بچہ ہے۔“

عرشہ کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک دیکھی ہوئی بھٹی کی آگ ایک گلاس پانی سے بچانے کی کوشش کر رہی ہیں اس لیے انہوں نے مناسب جانا کہ وہ خود منظر سے ہٹ جائے۔ یہ کہہ کر وہ ایک ہل کے لیے نہیں رنکس اور تیر رفتار سے آگے بڑھ گئیں گویا سیٹی کی آواز کے ساتھ ٹرین نے حرکت کی اور باہر کھڑے مسافر دوڑ پڑے۔ ان کے چلنے کا انداز کچھ ایسا تھا۔

”میرے بعد تمہارا کیا ہو گا عرشہ؟ تم یہ سب سنبھالنے کی اہلیت نہیں رکھتیں، یہ لڑکا سب جتاہ کر دے گا۔“

ٹمین کی سانس و جھجکی کی طرح چل رہی تھی۔ بڑ بڑاتی ہوئی قدم بڑھاتی تھیں، چھتری پر ٹکا ہوا ہاتھ کا بیچہ بھی لرز رہا تھا۔

☆☆☆

”شکر ہے کہ تم بات کرنے کی کوشش تو کر رہے ہو۔ کچھ تو sound effects آنا شروع ہو۔“ فری بہت ہمدردی سے زین کی طرف دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”نانو، مام کی شادی کر رہی ہیں فری، تم بھی چلی جاؤ گی..... مام بھی انکل کی پراپٹی بن جائیں گی..... پھر میں مر جاؤں گا۔“ زین اپنی پوری قوت جمع کر کے فری کے کان میں کہہ رہا تھا۔ پچھی، پچھی آواز جو ہے سُر کی سرگوشی کے مماثل تھی۔

”نہیں زین، یہ اتنا بڑا گھر تمہارا گھر ہے..... اور اتنی تو تم سے اتنا پیار کرتی ہیں کہ تمہیں بھی انکسور نہیں کر سکیں، انہیں نے مجھے کال کی، مجھ سے پراپر ٹیکو بسٹ کی کہ فری پلیز، کچھ وقت زین کو بھی دو، وہ بہت ڈپر ہے حالانکہ ابھی خاصی امیر و منٹ نظر آ رہی ہے۔“ فری نے نظر بچا کر چپکے سے سیل فون کی اسکرین کی طرف بھی دیکھا۔ اصر کے سچ کا ٹوٹیکشن تھا۔

”کوئی امیر و منٹ نہیں ہے، رات میں بہت زور سے چیخا تھا..... اتنی زور سے کہ مجھے لگا میری ہاڈی پھٹ جائے گی۔“ زین نے فری کے کان سے تقریباً اپنے ہونٹ چھو کر پچھی، پچھی آواز میں سرگوشی کی۔ فری ہونٹوں کی طرح زین کی شکل دیکھنے لگی۔

”بہت زور سے چیخے تھے؟“

”ہاں، ٹوٹل انرجی میرے ساؤنڈ ہاؤس میں آگئی تھی..... مگر پھر اتنی ہی آواز نکلی جیسے اب نکل رہی ہے۔“ زین نے بڑی ہلکے سے کہا، اس طرح کہ پہلے جیسے سرگوشی بھی نہیں تھی بس ہونٹ ہٹتے ہوئے سرسراہٹ ہی تھی۔

”یہ تو بہت hopeful ہے، اس کا مطلب ہے تم اپنی will سے اور زیادہ بھی امیر و دکر سکتے ہو۔ دیکھو زین،

آپنی مشکل جھڑپ ہیں، جہیں تو خود اپنی مام کو کنوئرس کرنا چاہیے کہ وہ شادی کریں۔۔۔۔۔ وہ لو اب بائیں young نظر آتی ہیں، تمہارے گھر کے فیملی ممبرز بڑھیں گے، آنٹی اور تانوسکی فضول سے بندے کو تو اپنا فیملی ممبر نہیں بنائیں گی تاں۔۔۔۔۔ تمہیں بھی قادر سپورٹ ملے گی۔“ فری بڑی سادگی سے بولتی جا رہی تھی۔ زمین آنکھیں پھاڑ کر فری کو دیکھ رہا تھا پھر وہ صوفے سے اٹھا، بیڈ پر بڑا ہینا سیل اٹھایا اور بیج ٹائپ کرنے لگا۔

فری کے سیل پر ٹوئٹنگ رینگ ہوئی تو اس نے زمین سے نظریں ہٹا کر اپنے سیل فون کی طرف دیکھا۔ زمین کا بیج دیکھ کر پہلے اس نے حیرت سے زمین کی طرف دیکھا پھر بیج open کیا۔

”اب تم جا سکتی ہو۔۔۔۔۔ I can't bear more۔“ (میں اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتا)

”زمین۔۔۔۔۔“ فری نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر زمین نے ہاتھ اونچا کر کے اسے روک دیا۔

☆☆☆

انصر اور نعیم قریشی واپس امریکا جا رہے تھے۔ دو چار دن کی بھاگ دوڑ سے فری کی امریکا روانگی کے ضمن میں ابتدائی کاغذی کارروائی کا آغاز تو ہو گیا تھا جس پر فری نے خود کو تصور میں امریکا کے گھر میں دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ زمین کے برے رویے کو اس نے زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا تھا، یہ سوچ کر کہ سیریس پیش پر اس طرح کے فیئر آتے رہتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انصر کے ساتھ کاغذی کارروائی کے سلسلے میں اتنے تو اتر سے آنا جانا لگا رہا کہ باقی تمام معاملات خود بخود غیر اہم ہو گئے تھے۔

انٹر نیٹ فلٹس تھی، بہت طویل سفر تھا۔ نعیم قریشی سفر کی طوالت کا بار، بارڈر کرتے ہوئے فری سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔

”میں نے اسے کہا تھا (انصر کی طرف اشارہ کر کے) کہ یار، باب یہ چوبیس، چوبیس گھنٹے والی فلٹس برداشت کرنے کے قابل نہیں رہا، stay کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں مگر یہ نہیں مانا مگر تم اس کے ساتھ دو تین کنٹریز پلان کر کے امریکا پہنچنا۔“

”تو کیا انکل، آپ میری رخصتی پر نہیں آئیں گے۔۔۔۔۔ انصر اکیلے آئیں گے مجھے لینے؟“ فری نے اپنی فطری۔۔۔۔۔ پراسٹیکل سے جس طرح کہا تھا، بائیں کٹری سارہ برگویا گھڑوں پانی پڑ گیا۔ چپکے سے سالار صاحب کی طرف بھی دیکھ لیا جو نعیم قریشی کے ساتھ ہم رکاب ہو کر بے ساختہ قہقہہ لگا رہے تھے۔

”ڈونٹ وری بیٹا، آخری بار امت ضرور کروں گا۔۔۔۔۔ پھر تمہارے باپ کی دوڑیں لگو آؤں گا، ان شاء اللہ۔“

جنگلاتی آواز پورٹ پر موجود غلطی خدا کی ملی جلی آوازیں، ساتھ وقفے، وقفے سے ہونے والے اعلانات کہ فلاں پرواز تیار، فلاں پہنچ چکی ہے، وغیرہ، وغیرہ۔ یہ ایسا جادوئی شور ہوتا ہے کہ ہر طرح کی بات چیت چل رہی ہوتی ہے مگر غیر متعلقین کو اپنے مخاطب کے علاوہ کسی کی بات نہ سنائی دیتی ہے نہ سمجھا آتی ہے۔

انصر نے بہت پیار سے فری کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے اسے اپنے باپ اور انکل، آنٹی سے قدموں سے ملے پرلے آیا تھا۔

”I am most lucky“ انصر نے کہا۔

”تم کو دیکھتے ہی دل نے کہا تھا۔۔۔۔۔ یہ تو میری ہے۔۔۔۔۔“ انصر الوداعہ ماحول میں فری کو خوشگوار یادیں دے کر۔۔۔۔۔ روات ہونا چاہتا تھا اس لیے اپنا نیت بھری باتیں شروع کر دیں۔

مگر اچانک اس نے اپنا دایاں ہاتھ بالکل پیٹ کے مرکز پر رکھ کر دایاں اور منہ سے ہلکی سی ”سی“ کی آواز نکلی۔ لیکن اور پھر بھی بائیں ہاتھ سے فری کا دایاں ہاتھ تھامے ہوئے تھا۔

(جاری ہے) دو

پر